نوش و نیش

عندلیب شادانی

نوش و نیش

از

ڈاکٹر عندلیب شادانی پروفیسر ڈھاکا یونیورسٹی

صدر شعبہ فارسی و اردو

ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب

کشمیری بازار	اردو بازار	فیریر روڈ
لاہور	لاہور	کراچی

فہرست

دیباچہ

سنہ [illegible]ء میں جس وقت میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سچی کہانیاں" پہلی بار شائع ہوا تھا اس وقت میں مختصر افسانے کے فنی اصول اور اس کی تکنیک سے واقف نہ تھا۔ چنانچہ کتاب کے دیباچے میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کر چکا ہوں۔ لیکن میری حیرت و مسرّت کی انتہا نہ رہی جب کتاب منظرِ عام پر آتے ہی اردو کے اکثر مقتدر رسالوں نے اس پر بے انتہا حوصلہ افزا تبصرے شائع کئے اور کتنے ہی حضرات و خواتین نے پرائیویٹ خطوط لکھ کر میری ہمت بڑھائی۔ البتہ ایک نقاد نے کتاب کی بہت کچھ تعریف کرنے کے بعد یہ بھی لکھا کہ "بعض افسانوں میں فنی خامیاں پائی جاتی ہیں" اس ریمارک نے مجھے مطالعۂ فن پر آمادہ کیا اور گزشتہ آٹھ سال میں یورپ اور امریکا کے بہت سے بلند پایہ مختصر افسانے میں نے پڑھ ڈالے اور اس فن کے متعلق کئی معتبر کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ اور "مختصر افسانہ" کے عنوان سے ایک مفصّل مضمون لکھا جو میری کتاب "تحقیقات" میں شامل ہے۔

ان حالات میں بجا طور پر مجھ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ میں نے "نوش و نیش" میں اس فن کی تکنیک اور اصولوں کو برتنے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان افسانوں کو لکھتے وقت ارادی طور پر اس

فن کا کوئی خاص اصول میرے پیش نظر رہا۔ میری کوشش صرف اس قدر رہی ہے کہ جن واقعات کو سن کر جس طرح میرا دل متاثر ہوا تھا، ان واقعات کو پڑھ کر دوسرے بھی اسی طرح متاثر ہوں اور ان آئینوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا صحیح عکس دیکھ سکیں۔ مطالعے کے دوران میں وہ اپنے گرد وپیش سے بے خبر ہو کر افسانے کے واقعات میں کھو جائیں اور ختم کرنے کے بعد کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔

مختصر افسانے کی تکنیک کے سلسلے میں ایک نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ جس طرح زبان پہلے بنتی ہے اور اس کے قواعد بعد میں وضع کئے جاتے ہیں اسی طرح کسی فن کے شاہکار پہلے وجود میں آتے ہیں اور اس فن کے اصول بعد میں مرتب ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک یگانۂ فن دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں کی پیروی نہیں کرتا بلکہ وہ ایک موجد اور مجتہد کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لے کر خود اپنی طبیعت خداداد سے اپنے لئے ایک نیا راستہ بنا لیتا ہے۔ اسی لئے اس کی فنی تخلیقات میں جدت اور تازگی ہوتی ہے۔

آرٹ کی دوسری تخلیقات کی طرح مختصر افسانے کے اصول بھی بہترین لکھنے والوں کے اعلیٰ فن پاروں ہی کو سامنے رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں۔ سچی کہانی اگرچہ بظاہر مختصر افسانے ہی کی ایک صنف معلوم ہوتی ہے لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ عام مختصر افسانے سے اس درجہ مختلف ہے کہ اس فن کے عام اصول اس پر صادق نہیں

آ سکے اور خود سچی کہانی کے بنیادی اصول ہماری زبان میں تو کیا خود یورپ میں بھی آج تک مدوّن نہیں ہوئے حالانکہ وہاں کتنے ہی ادبی رسائل اس موضوع کیلئے وقف ہیں۔

کسی نقاد نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے افسانے کی اس خاص صنف یعنی سچی کہانی کو ایک مستقل حیثیت دینے والا پریم پجاری کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔" بات دراصل یہ ہے کہ اکا دکا مثالوں کو چھوڑ کر مستقل طور پر سچی کہانیاں میرے سوا کسی نے نہیں لکھیں نہ کسی کی سچی کہانیوں کا کوئی مجموعہ کبھی شائع ہوا۔

جہاں تک اصول فن کا تعلق ہے میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ سچی کہانی کے اصول جس طرح آج تک معیّن نہیں ہو سکے اسی طرح آئندہ بھی نہ ہو سکیں گے کیونکہ ایک سچی کہانی اگر واقعی سچی کہانی ہو تو وہ کسی فن کار کے دماغ کی پیداوار نہیں ہوتی۔ حالات کا تقاضا واقعات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اسی کا نام سچی کہانی ہے۔ اب لکھنے والے کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ان واقعات کو ایک دل نواز اور پُر تاثیر پیرائے میں بیان کر دے۔ اور اس میں کامیابی حاصل کرنا لکھنے والے کے سلیقے اور صلاحیت پر منحصر ہے۔ کسی سچی کہانی کو ایک عام افسانے پر قیاس کر کے اگر کوئی نقاد اس کے متعلق یہ کہے کہ اس میں فنّی خامیاں ہیں تو درحقیقت یہ ایک بے معنی سی بات ہوگی۔

کہتے ہیں کہ افسانہ نگار کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ افسانے کو حقیقت بنادے،

اگر یہ سچ ہے تو مجھے یہ کمال مفت میں حاصل ہوگیا کیونکہ یہاں جو کچھ ہے حقیقت ہی حقیقت ہے جس کیلئے مجھے کسی تخلیقی قوت سے کام لینا نہیں پڑا۔ بایں ہمہ یہ بالکل ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو ان سچی کہانیوں میں شاید بعض اوقات اپنی غیر معمولی نوعیت کی بنا پر صحیح نہ معلوم ہوں کیونکہ "واقعات افسانوں سے کہیں زیادہ عجیب ہوتے ہیں" لیکن یہ بات مجھے کسی طرح گوارا نہ ہوئی کہ قارئین کے دل میں شکوک پیدا ہونے کے ڈر سے واقعات کو بدل دوں۔

بعض کہانیوں کے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میرے دماغ کی پیداوار سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ بظاہر ان میں ایسے عناصر موجود ہیں جن کی بنا پر انہیں میرا زادۂ طبیعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگائے تو میں اسکی تردید یا اس سے مواخذہ کرنے کے بجائے اس کے الزام کو بخوشی قبول کر لوں گا کیونکہ حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی طاقت میں اپنے میں نہیں پاتا۔

یہ افسانے جو اس وقت "نوش و نیش" کی صورت میں آپکے سامنے ہیں مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کے متعلق بعض اہل نظر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بیحد حوصلہ افزا ہیں۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میری سعی ناکام نہیں رہی۔

عندلیب شادانی

۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء

اسمٰعیل کھیت روڈ۔ رمنا۔ ڈھاکا

سچّی کہانی

ربیعہ

ڈرائنگ روم کی فضا کچھ افسردہ سی تھی۔ انور آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ ربیعہ سُن رہی تھی۔ مگر نہایت بے توجہی کے ساتھ۔ اور شاید اُس نے کچھ بھی نہ سنا ہو۔ اس کے ہاتھ میں السٹریٹڈ ویکلی کا تازہ پرچہ تھا۔ ورق اُلٹتی جاتی تھی۔ کبھی کوئی تصویر دیکھ لی۔ کبھی کہیں سے دو چار جملے پڑھ لئے، پھر ورق اُلٹ دیا۔ انور ہر لمحہ افسردہ سے افسردہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ ربیعہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

"چُپ کیوں ہو گئے آپ؟" اُس نے اخبار سے نظر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے دیواروں سے کچھ نہیں کہنا ہے۔" انور نے طنز کے ساتھ جواب دیا۔

"خوب! تو گویا میں دیوانہ ہوں!" ربیعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ربیعہ! میں مانتا ہوں کہ تم ذہین ہو۔ مگر دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرنا

ذہانت کا کوئی اچھا مصرف نہیں ہے۔"

"یا اللہ! آپ تو خواہ مخواہ بُرا مان گئے ہیں نے کچھ کہا بھی ہو۔"

"دیکھو ربعیہ میں بار بار تمہیں تکلیف دینے نہیں آؤں گا۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے تم اُسے ایک بار۔ صرف ایک بار توجہ کے ساتھ سُن لو۔ اس کا نتیجہ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ مگر اتمام حجّت ضروری ہے۔"

"میں پوری توجہ کے ساتھ سُن رہی ہوں۔ آپ فرمایئے۔" ربعیہ نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

انور چند لمحے خاموش رہا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اُس نے نہایت لپست آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"خدا شاہد ہے ربعیہ! اب تو یہ حالت ہے کہ بیان کروں تو کسی کو یقین نہ آئے! افسانوں میں اِس قسم کی باتیں بہت پڑھیں۔ مگر نہ کبھی یقین آیا نہ دل متاثر ہوا! ہمیشہ یہی سمجھا کہ غالباً بات کہنے کا یہ بھی ایک ڈھنگ ہے۔ بیان کا ایک اسلوب ہے۔ اور سچ پوچھو تو یقین آنے کی بات بھی نہیں۔"

"بھوک اور نیند انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ اور ان کی تسکین پر زندگی کا انحصار ہے۔ مگر کیا تمہیں یقین آئیگا کہ پچھلے مہینے میں کتنی ہی راتیں ایسی بھی گذریں کہ آدھی آدھی رات تک نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے کبھی کبھی رات کے دو دو اور کبھی تین بھی بج گئے۔ اور پچھلی رات تو قیامت کی رات تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ دل کی بے چینی اور

جسم کی ماندگی میں تمہیں کیوں کر سمجھاؤں ؟"

"پچھلے دو ہفتوں سے کھانے پینے کی جو صورت ہے خود میرے لئے باعثِ حیرت ہے۔ ناشتا کیا کیا، نہ کیا نہ کیا۔ کسی دن، دوپہر کا کھانا غائب، کبھی رات کو بھی یوں ہی سو رہے، کھانے کو جی ہی نہ چاہا۔ غرض اسی طرح وقت گزر رہا ہے۔ اور کچھ معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا روحانی کوفت اب میرے جسم کو بھی کھا رہی ہے۔ اور بالکل ممکن ہے کہ . . . "

"آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔" ربیعہ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے مشورے کا شکریہ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ڈاکٹر نے نوشِ حیات کے بدلے مجھے صرف زہرِ قاتل دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اور . . . . "

"یہ محض آپ کا خیال ہے۔" ربیعہ نے پھر انور کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر کڑوی دوا اس لئے ہرگز نہیں دیتا کہ اسے مریض سے کوئی دشمنی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اس کی صحت اور بہبودی چاہتا ہے۔ تلخ دوا ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی اسے نشتر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ نشتر کی اذیت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، مگر ڈاکٹر کی نیت پر شبہ کوئی نہیں کرتا۔"

"ربیعہ! میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں خدارا مجھے کہہ لینے دو۔ اور اپنے اوپر تھوڑا سا جبر کر کے اسے سن بھی لو۔"

"اچھا اب نہ بولوں گی۔ آپ کہئے۔"

"کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ پہلے میرے چند سوالوں کا جواب دو۔"

"پوچھئے۔"

"رضیہ نے جب تم سے پوچھا تھا کہ ربیعہ کیا تم بھی انور کو چاہتی ہو تو تم نے کہا تھا کہ چاہت کا حال تو مجھے معلوم نہیں مگر میں ان کے جذبات کا احترام ضرور کرتی ہوں۔ تمہارے اس جواب کو میں اعترافِ محبت تو نہیں کہہ سکتا لیکن ان لفظوں کے آخر کچھ معنی تو ہیں۔ معلوم نہیں تمہارا وہ قول درست تھا یا تمہارا موجودہ طرزِ عمل۔ کیا آج بھی تم میرے جذبات کا احترام کرتی ہو؟"

"کرتی ہوں۔ اور اس سے زیادہ جتنا آپ سمجھتے ہیں۔" ربیعہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا

"ربیعہ تمہاری باتیں میرے لئے معمّا ہیں۔ تم نے اکثر اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر میری ذہانت کی تعریف کی ہے۔ اور مجھے تمہاری اس پیشین گوئی کا بھی علم ہے۔ کہ انور بی۔اے میں ساری یونیورسٹی میں فرسٹ آئے گا۔" حُسنِ اتفاق سے تمہاری وہ پیشین گوئی پوری بھی ہو گئی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر واقعی میں ایک ذہین آدمی ہوں تو پھر تمہاری باتیں میری سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟ خیر میں نہایت صفائی کے ساتھ چند باتیں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم بھی کسی مصلحت کا لحاظ کئے بغیر اتنی ہی صفائی کے ساتھ جواب دو گی۔"

"اپنے منہ سے اپنے متعلق کچھ کہنا خودستائی سمجھی جاتی ہے۔ مگر بیانِ واقعہ کو میں خودستائی نہیں سمجھتا۔ اور امید ہے کہ تم بھی نہ سمجھو گی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ہم دو کے سوا کوئی تیسرا درمیان میں نہیں۔ شرافت نسبی پر مغرور تو میں ہرگز نہیں۔ لیکن دنیا کے رسمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میرا خاندان اُن خاندانوں میں سے ایک ہے جو اِن

اطراف میں معزز اور شریف گنے جاتے ہیں۔ کیا تم اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہو۔"

"بیشک۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ پچھلے مہینے تمہارے ابا جان نے والد صاحب اور دوسرے عمائدین شہر کو اتنی دھوم دھام کا ڈنر کیوں دیا تھا؟"

"معلوم ہے۔ اس امر پر اظہارِ مسرت کے لئے کہ آپ کے والد صاحب کمشنر ہو گئے اور اور وہ اس ڈویژن کے پہلے ہندوستانی اور پہلے مسلمان کمشنر ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ چھ مہینے کے بعد ریٹائرڈ ہو جائیں گے۔ پھر بھی یہ اعزاز کتنوں کو نصیب ہوتا ہے۔"

"کمشنر کا بیٹا ہونا غالباً تمہارے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔"

"ہرگز نہیں۔"

"میرے اخلاق و اطوار میں تمہیں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو تمہارے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہو؟"

"نہیں میں نے تو ہمیشہ آپ کے پاکیزہ اخلاق کی ستائش کی ہے۔"

"یونیورسٹی میں ہاکی کا ایک اچھا کھلاڑی اور فٹ بال ٹیم کا کیپٹن ہونا غالباً جسمانی صحت کا ایک معقول سرٹیفکیٹ ہے؟"

"یقیناً۔"

"اپنی شکل و صورت کا ذکر مجھے زیب نہیں دیتا۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری صورت اگر اچھی نہیں تو کچھ ایسی بری بھی نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کالج کی لڑکیوں میں جس کی شکل و صورت کا اکثر چرچا رہتا ہو۔ اُس کی خوب روئی کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔"

"چلو اب مجھے بناؤ نہیں۔ کالج کی دوسری لڑکیوں کی رائے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں میں فقط تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

"مگر میری رائے تو آپ بہت پہلے سے جانتے ہیں۔" ربیعہ نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا صرف اتنا بتا دو کہ تمہیں میری صورت سے وحشت تو نہیں ہوتی۔؟"

"بعض اوقات آپ خواہ مخواہ ستانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

"جہاں تک میں اندازہ کر سکتا ہوں، تمہاری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ بظاہر میرے اندر ایسی کوئی برائی نہیں جس کی بنا پر تم مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے رنج و راحت کا شریک بنانا پسند نہ کرو۔ پھر کیا سبب ہے کہ میری حالت کو اچھی طرح جانتے ہوتے، سمجھتے ہوئے، کل کے خط میں تم نے مجھے صاف جواب دے دیا۔ اور پھر اس کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی۔"

ربیعہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"میرا خیال تھا کہ آپ میرے انکار کی وجہ سمجھ گئے ہونگے۔ مگر جذبات کے طوفان میں انسان نہ کچھ دیکھ سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ کہ اپنی زبان سے اُس تلخ حقیقت کا اظہار کروں جو میری اور آپ کی دائمی وابستگی میں حائل ہے۔ مگر آپ

مجبور کرتے ہیں تو مجھے بھی صاف صاف کہنا پڑتا ہے کہ آپ جذبات کے ریلوں میں بہہ رہے ہیں۔ اور میرے سامنے ایک ناقابلِ انکار، ایک ٹھوس حقیقت ہے یعنی آئندہ زندگی۔ میرا سارا مستقبل۔ شادی کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ گھڑی بھر کا مشغلہ نہیں میرا آج کا فیصلہ مجھے زندگی بھر کے لئے خوش حال یا بدحال بنا سکتا ہے۔"

"میری صاف گوئی سے آپ آزردہ نہ ہوں۔ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود دنیوی نقطۂ نظر سے آپ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ دوسروں کے دست نگر ہیں۔ مانا کہ آپ کے والد صاحب ایک نہایت معزز عہدہ دار ہیں۔ ان کے پاس دولت بھی ہے۔ مگر ان کی دولت کے آپ تنہا وارث نہیں —— ماشاء اللہ چار بھائی اور دو بہنیں اور بھی آپ کی شریک ہیں۔ ذرا سوچئے تو آپ کا حصّہ اُس دولت میں کتنا ہونا ہے؟ —— کل آپ کیا ہو جائیں گے۔ اس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ شاید بہت کچھ ہو جائیں۔ شاید کچھ بھی نہ ہوں۔ اس کا نام دُنیا ہے۔ فقط امیدوں کے آسرے پر میں اپنی ساری زندگی کی بازی نہیں لگا سکتی۔ ایسی شادی کسی طرح سٹّے سے کم نہیں اور سٹّا کھیلنے والوں کو میں نے ہمیشہ تباہ و برباد ہی ہوتے دیکھا ہے۔"

"پھر میرے حالات اور میری اُفتادِ طبع سے بھی آپ واقف ہیں میں نے آنکھ کھول کر عیش و عشرت اور آرام و راحت کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اسی کی میں خوگر ہوں۔ ذرا سی تکلیف برداشت کرنا بھی میرے لئے بہت دشوار ہے۔ سیر تفریح، کھیل کود، پارٹیاں جلسے میرے شب و روز کے مشغلے ہیں۔ سجا ہوا گھر ہو۔ بہت سے نوکر چاکر ہوں۔ موٹریں

ہوں۔ گھوڑے ہوں۔ بہترین لباس ہوں۔ لذیذ کھانے ہوں۔ تفریحات کے سامان ہوں میرے لئے یہ سب لوازمِ زندگی ہیں۔ اپریل کا مہینہ آیا اور پہاڑ پر چلے گئے۔ کبھی کشمیر، کبھی دارجلنگ کبھی شملہ، کبھی مسوری۔ گرمیاں وہاں گذاریں۔ بڑے دن پر کلکتہ کی سیر کی، کبھی بمبئی ہو آئے غرض ہمیشہ اسی طرح وقت گذارا۔ اور اسی طرح اب بھی گذر رہا ہے۔ اس میں ذرہ اسی بھی کمی ہو تو زندگی ایک مصیبت، ایک عذاب بن جائے۔ اپنے موجودہ حالات کو دیکھئے میرے مطالبات کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالئے اور ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس شادی کا انجام سوائے غم کے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ صرف دولت سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔" انور نے طنز کے ساتھ کہا۔

"آپ جو کچھ بھی سمجھیں، مگر میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسانی خوبیوں کے ساتھ ساتھ دولت بھی ایک لازمی چیز ہے۔ مگر میں کسی ایسے شخص کو بھی اپنا شریکِ زندگی بنانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتی جس کے پاس دولت کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ دولت کے سوا، اچھی صورت، اچھی سیرت، مکمل صحت، بھرپور جوانی، شگفتہ مزاجی، اعلیٰ تعلیم اور کم سے کم متوسط درجے کی ذہانت اس شخص کی لازمی صفات ہیں۔ جسے میں اپنا شریکِ حیات بنانا پسند کروں گی۔"

"اور بالفرض ایسا آدمی نہ مل سکے تو؟"

"تو پھر ازدواجی زندگی سے تنہائی کی زندگی بہتر ہے۔"

"ربیعہ! ابھی تم فطرت کے تقاضوں سے واقف نہیں ہو۔ تنہائی کی زندگی زندگی ہی نہیں ہوتی۔ مگر اس کا احساس انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب پانی سر سے گذر جاتا ہے۔ اور سوائے پچھتانے کے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تنہائی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے انسان اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مگر اُس وقت اس کا "سب کچھ" بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔"

شاید آپ کا خیال صحیح ہو۔ مگر میں نے مغل شہزادیوں کے حالات پڑھے ہیں۔ وہ مغل شاہزادیاں جو زندگی بھر کنواری رہیں۔ میں ایسی مشنری یورپین خواتین سے بھی ملی ہوں جنہوں نے ساری عمر تجرّد میں گذار دی۔ میں ایسی کئی استانیوں سے واقف ہوں جن کے سر سپید ہو گئے اور جنہوں نے کبھی شادی نہیں کی۔ اور پھر اُن سے کبھی کوئی ایسی لغزش بھی سرزد نہیں ہوئی جس کی بنا پر انہیں اخلاقی مجرم قرار دیا جا سکے۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ فطرت کے جن تقاضوں کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اُن کی اہمیت اتنی نہیں جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ یقیناً انہیں مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ اور اُن کی خاطر اپنے سارے نظامِ زندگی کو بدل ڈالنا اور عیش و راحت کو ٹھکرا کر تکلیف و مصائب کو اپنی جان پر لینا نہ صرف ناعاقبت اندیشی بلکہ خدا کی ناشکری بھی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ کاش تمہیں کسی سے محبت ہوتی۔ اُس وقت تمہاری منطق کا انداز کچھ اور ہوتا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ جذبات کے جوش میں آپ نے محبت کی نوعیت کو سمجھنے اور

اُس کے نتائج پر غور کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی ـــ محبّت کی شادیاں میں نے دیکھی ہیں۔ اور اُن کے نتائج سے بھی واقف ہوں۔ محبت کا جذبہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو۔ کوئی مستقل چیز نہیں۔ ہر جذبے کی طرح تھوڑے دنوں میں یہ بھی دھیما پڑ جاتا ہے۔ اور اکثر فنا بھی ہو جاتا ہے۔ چند مہینے اور شاذ و نادر چند سال سے زیادہ اس کی عمر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جب زندگی کی تلخ حقیقتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور آپس میں ناخوشگواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو محبت کسی کی مدد کو نہیں آتی۔ محبت اور صرف محبت تمام جسمانی اور مادّی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دولت اور صرف دولت کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے نہایت صفائی کے ساتھ اپنے خیالات آپ کے سامنے پیش کر دیئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے۔ اور میرے خلوص اور صداقت پر کبھی شک نہ کریں گے۔"

" ربیعہ خاموش ہو گئی۔ انور بالکل ساکت و صامت بیٹھا ہوا تھا۔ کئی منٹ تک ڈرائنگ روم میں بالکل سنّاٹا رہا۔ آخر انور نے پہلو بدلا اور نہایت پست و حزیں آواز میں بولا۔

" ربیعہ! قدرت نے تمہیں ایک ہیرے کی مانند بنایا ہے۔ بہت قیمتی بلکہ انمول ہیرا مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ اس کی تابانی سے جب میری آنکھیں بالکل خیرہ ہو گئیں اور اُسے پا لینے کے سوا دنیا میں اب اور کوئی آرزو نہیں تو مجھے بتایا جاتا ہے کہ ہیرے تاج میں لگتے ہیں۔ امیروں کا زیور بنتے ہیں۔ ہر کس و ناکس کے لئے نہیں ہوتے ـــ

ہاں اِس ہیرے کی درخشندگی اور تابانی دوسروں کے لئے ہے اور اس کی ہلاکت آفرینی میرے لئے۔ سُنا تو تھا کہ ہیرے کی کنی سمِ قاتل ہوتی ہے۔ مگر یہ خبر نہ تھی۔ کہ میرا حصّہ فقط زہر آبگینی ہوگی۔ اچھا ربعیہ، خدا حافظ۔ غالباً یہ ہماری آخری ملاقات ہے خدا کرے تم اپنی آرزو کے مطابق کسی تاج کی زینت بنو۔"

وہ کھڑا ہوگیا۔ ربعیہ پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ ربعیہ کی "گڈ نائٹ" (شب بخیر) غالباً اُس نے نہیں سُنی۔

ربعیہ کے ساتھ اس آخری ملاقات کے بعد انور علی گڑھ چلا گیا۔ اور یونیورسٹی میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت اور پھر مسلسل محنت کا نتیجہ اس کی نمایاں کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور وہ ٹریننگ کے لئے ولایت بھیج دیا گیا۔ اور واپسی پر اپنے ہی صوبے میں سب ڈویژن آفیسر کی حیثیت سے اس کا تقرر ہوا۔ کمشنر صاحب اور اُن کی بیوی کو اپنے آئی۔ سی۔ ایس بیٹے کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ بہت زور شور سے لڑکی کی تلاش ہو رہی تھی۔ ایسی لڑکی جو ہر طرح انور کی رفیقِ حیات بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

ربعیہ کی شادی اب تک نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ انور کے دل سے اُس کا خیال دُور ہوا تھا۔ مگر اُس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ ربعیہ سے شادی ہرگز نہ کرے گا۔ ربعیہ نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا صرف اِس لئے کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ اسکا

خیال تھا کہ جس عورت کی محبت صرف دولت سے خریدی جا سکتی ہو۔ اُس سے زیادہ خطرناک انسان دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

انور کے بڑے بھائی اختر اودھ میں کہیں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اُن کی شادی بھی اسی سال ہوئی تھی اور ربیعہ کی سہیلی رضیہ جو انور کی ہم سبق بھی رہ چکی تھی۔ اب انور کی "بھابی جان" تھی۔ مگر انور ہمیشہ رضیہ ہی کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اختر ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے تھے۔ رضیہ بھی ساتھ تھیں۔ بڑے دن کی تعطیل میں انور بھی گھر آیا۔ کئی دن خوب چہل پہل رہی۔ اب تک جن لڑکیوں کا پتہ چلا تھا ان کے متعلق انور کی والدہ نے انور سے گفتگو کی۔ مگر ابھی کوئی بات طے نہیں پائی تھی کہ ایک دن تنہائی میں رضیہ اور انور کے درمیان باتوں ہی باتوں میں ربیعہ کا ذکر آ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ربیعہ کا نام سنتے ہی انور کے دل پہ ایک چوٹ سی لگی۔ اُس نے رضیہ سے کہا:۔

"کیا اب تک ربیعہ کو کوئی دولت والا نہیں ملا؟"

"پیام تو کئی جگہ سے آئے۔ مگر اُس نے منظور ہی نہ کیا۔"

"شاید اُس کی دولت ربیعہ کی نظر میں نہیں جچی۔"

"یہ بات نہیں۔"

"تو پھر کیا؟"

"اس نے کہا کہ محبت کے بغیر شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسان کسی یتیم خانے کا آنریری سکریٹری ہو جائے۔ اور مجھ میں کسی کارِ خیر کی اتنی صلاحیت نہیں ـــــ"

"خوب! محبّت اور شادی کا یہ نیا فلسفہ ربیعہ نے کب سے سیکھا؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ سچ کہتی ہے؟"

"ہاں، مجھے تو یقین ہے۔"

"تو شاید پچھلے تین سال میں یہ انقلاب اُس کے خیالات میں رونما ہوا ہے؟"

"نہیں۔ اس کے خیالات تو جو پہلے تھے وہی آج بھی ہیں۔"

"یہ کیونکر ممکن ہے۔ پہلے وہ دولت کی خواستگار تھی۔ اب محبت کی آرزومند ہے۔"

"خیالات کا یہ اختلاف فقط ظاہری ہے۔ تمہارے ولایت جانے سے چند روز پہلے، ایک مرتبہ اس موضوع پر ہمارے درمیان مفصّل گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ ربیعہ میں نہ کہتی تھی کہ انور ضرور ایک نہ ایک دن کسی ممتاز حیثیت کا مالک ہوگا۔ تم نے بڑی غلطی کی کہ اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اُس نے کہا رضیہ تم نہیں جانتیں کہ انور کو آئی سی۔ ایس کس نے بنایا۔ میں انکار نہ کرتی تو شاید انور آئی سی۔ ایس کبھی نہ بنتے۔ میں جانتی ہوں کہ محبت میں بے پناہ طاقت ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ محبت کی ناکامی جذبۂ انتقام کو مشتعل کر دیتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ یہ تو ممکن تھا کہ انور آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوتے لیکن ضرور نہیں کہ وہ کامیاب بھی ہو جاتے۔ میرے انکار نے اُن کے جذبات میں آگ لگا دی۔ مجھ سے انتقام لینے کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ یعنی وہ کوئی ایسا کارنمایاں کر کے دکھائیں کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور میں ان کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا

محنت کی لگاتار محنت کی۔ رات دن ایک کر دیئے۔ اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ یہی میں چاہتی تھی اور اسی لئے یہ سب جتن کئے تھے۔ میری آرزو تھی۔ کہ میرا رفیقِ زندگی سوسائٹی میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہو۔ تم تو جانتی ہو، انور کے سوا کبھی کوئی میرے جذبات کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکا۔ مگر میں نے اس حقیقت کو ایک حد تک تم سے بھی چھپایا۔ مقصود صرف اتنا تھا۔ کہ انور اپنی فطری صلاحیتوں سے پورا پورا کام لے کر دنیا میں کوئی مقام حاصل کر سکیں۔ غالباً اب تم اندازہ کر سکو گی کہ انور کے آئی۔ سی۔ ایس ہونے میں میری تدبیر کو کس حد تک دخل ہے۔ میں نے کہا۔ مگر ربیعہ، انور کے ساتھ شادی سے انکار کرتے وقت تم نے یہ نہ سوچا کہ ایک بار قطعی انکار کے بعد پھر اقرار کی کیا صورت ہو گی۔ اُس نے کہا ہاں یہ مجھ سے چوک ہوئی۔ اُس وقت اِس بات کا خیال ہی نہ آیا۔ سوچا تھا کہ خود ہی کوئی صورت نکل آئے گی۔ مگر قدرت کو شاید یہی منظور تھا۔ کہ ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کو اپنا نہ بنا سکیں۔ میں نے کہا، اگر تم اجازت دو تو میں انور سے تحریک کر دوں۔ اس نے کہا رضیہ مر جانا قبول ہے۔ اور التجا کی ذلت گوارا نہیں مجھے اپنی عزت محبت سے کہیں زیادہ پیاری ہے۔ محبت کو عزت پر قربان کر سکتی ہوں، لیکن محبت کی خاطر کسی کی نظروں میں سُبک ہونا کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ تم جانتے ہو، وہ بلا کی خود دار لڑکی ہے۔ خیر اس وقت تو بات ٹل گئی۔ مگر تمہارے ولایت سے آنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ تمام باتوں کے باوجود تمہارے دل سے اس کا خیال اب تک نہیں نکلا۔ اور خود اس کی بھی یہی

کیفیت دیکھی تو ایک دن میں نے پھر اس ذکر کو چھیڑا —— وہ یکایک مجھ سے چمٹ کر رونے لگی۔ اُس نے کہا رضیہ اب اس ذکر کو چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے میں تہیہ کر چکی ہوں کہ ساری زندگی اسی طرح گذار دوں گی کسی دوسرے سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انور اگر خود بھی خواستگار ہوں تو میں انکار کر دوں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں انور کو اس بات کا اچھی طرح یقین دلا چکی ہوں کہ مجھے اُن سے محبت نہیں۔ اور اُن سے زیادہ میں دولت کو چاہتی ہوں۔ اب اگر آج میں اُن سے شادی کر لینے پر آمادہ ہو جاؤں تو اُن کی نظر میں میری کیا وقعت ہو گی؟ —— یقیناً وہ یہی سمجھیں گے کہ آئی سی ایس نے ربیعہ کو خرید لیا۔ مگر ربیعہ اتنی ارزاں نہیں ہے میں کسی طرح بھی اس بات کو ثابت نہیں کر سکتی کہ میں نے ہمیشہ اُن سے محبت کی اور آج بھی میری زندگی کی خوش گوار ترین ساعتیں وہی ہوتی ہیں جب میں اُن کے تصور میں کھوئی ہوئی ہوتی ہوں۔ رضیہ! میری قیمت صرف بے لوث محبت ہے۔ اور اب وہ مجھے کسی طرح نہیں مل سکتی۔ انور سے مجھے کوئی شکوہ نہیں قصور خود میرا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میرا بھی نہیں۔ قسمت کا پھیر ہے۔ میں نے کہا ربیعہ تم خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس بے تعلقی اور کشیدگی کے باوجود انور آج بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے۔ جتنا کبھی پہلے چاہتا تھا۔ اُس نے کہا یقین دلانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے خود معلوم ہے میرا دل گواہی دیتا ہے۔ اور میری آج کی بات لکھ رکھو کہ کسی دوسری لڑکی سے شادی کے بعد بھی وہ "بے وفا" اور "بے درد" ربیعہ کو اپنے دل سے نہ بھلا سکیں گے۔ اس کے

بعد بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئی۔ کہ میں تمہارے اور اس کے درمیان صفائی کی کوشش کروں۔"

انور یہ تمام تفصیلات سن کر تڑپ اٹھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عالم خیال میں ربیعہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی۔

"بیوفا کون ہے۔ بتلایئے نا۔ آپ کہ ہم؟"

ایک ہی لمحے میں اُس کے دل سے ربیعہ کی تمام شکایتیں دُور ہو چکی تھیں۔ ایک ہی لمحے میں اُس کے دل کی تمام گنجائشیں ربیعہ کی محبت سے پہلے کی طرح معمور ہو چکی تھیں۔ اُس نے بیتاب ہو کر کہا۔

"رضیہ! کیا اب کوئی صورت نہیں ہو سکتی؟"

رضیہ نے کہا:۔

"کیا بتاؤں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ربیعہ میں جہاں اور ہزاروں خوبیاں ہیں۔ وہاں وہ بلا کی خوددار بھی ہے اور بدقسمتی سے بے انتہا ضدی بھی۔ ایک بار وہ مُنہ سے "نہیں" کہہ دے تو پھر اُس سے "ہاں" کہلوانا ناممکن ہے۔ مگر ہاں ایک بات ہے اگر تمہارا اور اس کا سامنا ہو جائے اور گفتگو کا موقع ملے تو بہت ممکن ہے کہ وہ متاثر ہو جائے۔ اور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس لئے کہ محبت کا سیل جب امنڈتا ہے تو مضبوط سے مضبوط عقیدے اور پختہ سے پختہ ارادے اسکے سامنے

تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔ آج ہی بلکہ اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔"

انور نے کہا:۔

"لیکن اگر اس نے مجھ سے ملنے ہی سے انکار کر دیا تو؟"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا خصوصاً ایسی حالت میں کہ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔"

آدھے گھنٹے کے اندر انور، رضیہ اور ربیعہ اُسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جہاں تین سال قبل ربیعہ اور انور کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ احوال پرسی اور چند رسمی باتوں کے بعد رضیہ یہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی کہ

"میں ابھی آئی۔ ذرا خالہ جان (ربیعہ کی والدہ) کے پاس ہو آؤں۔"

اب ڈرائنگ روم میں صرف ربیعہ اور انور تھے۔ وہ ایک دوسرے کے مقابل کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ اسی طرح کئی منٹ گذر گئے۔ دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ آخر انور نے ہمت کر کے طلسم خاموشی کو توڑا اُس نے کہا:۔

"تین سال کے اندر آپ میں ذرا بھی تغیر نہیں ہوا۔"

"ہوا کیوں نہیں۔ پہلے "تم تھی" اب "آپ" ہوں۔"

انور مسکرایا۔ ربیعہ کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ پھر کوئی دو منٹ تک دونوں خاموش رہے۔ اس مرتبہ ربیعہ نے ابتدا کی:۔

"آپ تو اس تین سال میں بہت بدل گئے ہیں۔"

"مگر دیکھنے والے تو کہتے ہیں کہ میں ذرا بھی نہیں بدلا۔"

"دیکھنے والوں کی نظر سطح سے نیچے نہیں جاتی۔"

"آپ کا خیال ہے کہ میں بدل گیا؟"

"یقیناً۔"

"اس کا ثبوت؟"

"دو برس کے بعد آپ ولایت سے واپس آئے۔ مگر یہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ابّا جان اور امّی جان دونوں آپ کو یاد کرتے رہے۔"

"اور اس بنا پر آپ کہتی ہیں کہ میں بدل گیا۔"

"ظاہر ہے۔"

"مگر نہ آنے کی وجہ کچھ اور بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"کوئی راز کی بات نہ ہو تو فرمایئے۔"

"بات تو راز کی ہے۔ مگر کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔ درحقیقت میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ سے سامنا ہو۔"

"اللہ اکبر۔ اتنی نفرت۔ تو پھر اب کیوں زحمت کی آپ نے؟"

"مجبور ہو کر۔"

"کس نے مجبور کیا آپ کو؟"

"دل نے۔"

"اور آج تک یہ دل کہاں تھا؟"

"ربعیہ! آج تک میں ایک سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ رضیہ نے آج میری آنکھیں کھول دیں۔ تمہارے اُس کے درمیان میرے متعلق وقتاً فوقتاً جو گفتگو ہوئی تھی۔ وہ سب اُس نے مجھے سنائی۔ اور میرا خیال ہے کہ زندگی میں اپنی کسی غلطی پر ندامت کا اتنا شدید احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"رضیہ نے سب کچھ آپ سے کہہ دیا؟" ربعیہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں سب کچھ۔"

"مجھے اُس سے ایسی اُمید نہ تھی۔"

"رضیہ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ اس بارے میں کیا فیصلہ کر چکی ہیں۔ مگر وہ فیصلہ یک طرفہ ہے۔ اس لئے قابلِ قبول نہیں۔"

"خوب، تو آپ مجھے آئی۔ سی۔ ایس کی قیمت پر خریدنے آئے ہیں؟"

"ربعیہ! تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہیں کیا خریدوں گا۔ میں تو خود تمہارے ہاتھ بِک چکا ہوں۔"

"مگر میرا فیصلہ تو آپ کو معلوم ہے۔ اور میرے لئے اس میں کسی ردو بدل کا امکان نہیں۔"

"خیر میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس صورت میں تمہارا عطیہ بھی تمہیں کو مبارک

"میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب!" ربعیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت یہ آئی سی۔ایس کا عہدہ مجھے تمہاری محبت اور اور حسنِ تدبّر کی بدولت نصیب ہوا ہے۔ اب اگر تمہاری نظر میں یہ اتنا ہی ذلیل ہے تو میری نظر میں بھی اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر تم اپنی بے جا ضد چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو تو میں بھی آج ہی استعفےٰ بھیجدوں گا۔"

ربعیہ سخت کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی۔ یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ گفتگو اِس نقطہ پر پہنچکر ختم ہو گی۔ وہ حیران تھی کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ انور کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اُسے یقین تھا کہ انور نے جو کچھ کہا ہے وہی کرے گا چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ انور کی بنی بنائی زندگی کو اس طرح تباہ کرنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ وہ سخت پریشان ہو گئی۔ اور گھبرا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ انور یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے نہایت مغموم لہجے میں کہا۔

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

اور وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ربعیہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اور اُس نے انور کو پکارا:۔

"سنئے تو!"

انور پلٹا۔ دونوں ہاتھ پس پُشت رکھ کے ربعیہ کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اور کہا:۔

"فرمایئے!"

"آپ استعفا نہیں بھیجیں گے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ کے بقول وہ میری چیز ہے۔ اور میں اُسے کھونا نہیں چاہتی۔"

"تو آپ اُسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟"

ربیعہ نے سر جھکا کر کہا:۔"ہاں۔"

انور کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ رخسار تمتما گئے۔ سینے میں دل کی حرکت اور رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو گئی۔ اُس نے ذرا آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ ربیعہ کے کاندھوں پر رکھ دیئے۔ ربیعہ کے جسم میں اُسے ایک کپکپی سی محسوس ہوئی۔ اُس نے جرأت کر کے داہنا ہاتھ ربیعہ کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اُس کا جھکا ہوا سر اُوپر کو اٹھایا اور بے اختیار اُس کے لبوں پر مہرِ محبّت ثبت کر دی۔ ربیعہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا بند بند کانپ اُٹھا۔ انور بھی سراپا ارتعاش بن گیا۔ دونوں کے لئے زندگی میں یہ پہلا لذّت آفریں تجربہ تھا۔

جلد ہی ربیعہ اور انور کی شادی ہو گئی۔

حُسن۔ جوانی۔ تندرستی۔ دولت۔ محبّت اور اطمینان، حقیقی مسرّت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مگر ان سب کا اجتماع شاذونادر ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہے۔ اور یہ سب چیزیں بیک وقت کسی کو میسّر آ جائیں۔ تو پھر دنیا ہی اس کے لئے بہشتِ جاوداں ہے

ربیعہ اور انور اُن چند خوش نصیب ہستیوں میں سے تھے۔ جو دنیا میں رہ کر فردوسی مسرتوں سے جی بھر کے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ زندگی کی ہر ساعت خوشی کا ایک تازہ پیغام لیکر آتی تھی۔ شادمانیاں اور کامرانیاں قدم قدم پر اُن کا استقبال کرتی تھیں۔ دعوتیں، جلسے پارٹیاں، سینما۔ گھوڑ دوڑ۔ پکنک۔ بوٹنگ۔ سواری۔ سیر۔ شکار۔ غرض تفریحات کا ایک دَور تھا۔ جو کہیں تمام نہ ہوتا تھا۔ اطمینان اور فارغ البالی نے ربیعہ کے حُسن عالم آشوب کو اور بھی نکھار دیا تھا انور بھی نہایت خوبرو جوان اور دلچسپ انسان تھا۔ سوسائٹی میں اس خوش نصیب جوڑے کی بہت مانگ تھی۔ کوئی صحبت ان کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی۔ غرض عیش و نشاط کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا۔ جو تشنۂ تکمیل رہ گیا ہو۔ کوئی آرزو ایسی نہ تھی۔ جو پوری نہ ہوئی ہو۔ وقت کا تیز پر طائر سرعت کے ساتھ اڑا جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک سال نکل گیا۔

ربیعہ کو گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ اکثر وہ اور انور صبح سویرے ہی سیر کو نکل جاتے۔ گھوڑے کنوتیاں ملائے قدم قدم چلتے۔ یہ دونوں باتیں کرتے جاتے۔ گل ہائے بہار کی طرح شگفتہ و شاداب چہرے۔ تندرست جوانیاں۔ ارمانوں سے بھرے دل۔ ہنستے، بولتے، گنگناتے چلے جاتے کبھی گھوڑوں کو ذرا تیز کر دیتے۔ تھوڑی سی دوڑ ہو جاتی۔ ربیعہ کا گھوڑا عموماً آگے نکل جاتا۔ گھوڑا بھی اچھا۔ سوار بھی اچھا۔ پھر حریف خود ہارنے پر آمادہ۔ جیت کیوں نہ ہوتی۔

ایک دن واپس آ رہے تھے۔ کہ پیچھے سے ایک ملٹری ٹرک نے زور سے ہارن

بجایا۔ دونوں گھوڑے اس کے عادی تھے۔ مگر خدا جانے کیوں۔ ہارن کی آواز سن کر انور کا گھوڑا بھڑکا۔ انور باگ ڈھیلی چھوڑے بے فکری سے بیٹھا تھا۔ اچانک گھوڑا بھڑکا تو آسن اکھڑ گیا۔ رکاب میں سے پاؤں نکل گئے۔ اور وہ دھم سے زمین پر آ رہا۔ ربیعہ بدحواس ہو گئی۔ ملٹری والوں نے ٹرک روک لیا۔ سب لوگ انور کی طرف دوڑے۔ اُس کے گھٹنے میں سخت چوٹ آئی تھی۔ پاؤں سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی ٹرک میں ڈال کر انور کو ہسپتال لے جایا گیا۔ پہلے معائنہ ہوا۔ پھر ایکس رے معلوم ہوا گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ گھر میں ایک ماتم بپا ہو گیا۔ ربیعہ نے روتے روتے اپنا بُرا حال کر ڈالا۔ شہر بھر کو اس حادثے کا قلق تھا۔

علاج شروع ہوا۔ بہتر سے بہتر ڈاکٹر۔ ہوشیار سے ہوشیار نرسیں قیمتی سے قیمتی دوائیں زیادہ سے زیادہ توجہ اور احتیاط۔ مگر نتیجہ صفر۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہو گئے لیکن مرض اور تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ انور کے والد بالآخر انور کو ہسپتال سے گھر لے آئے۔ اور گھر ہی پر علاج جاری رہا۔ ہڈی تو ٹھیک سے نہ جڑی۔ مگر زخم ناسور بن گیا ڈاکٹروں نے کہا کہ اگر ٹانگ کاٹی نہ گئی تو جان کا خطرہ ہے۔ انور اپاہج ہو کر جینے سے موت کو بدرجہا بہتر سمجھتا تھا۔ مگر ماں باپ کی محبت نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔ کہ ان کے گھر کا سب سے زیادہ روشن چراغ اس طرح بجھ جائے۔ ناچار ٹانگ کاٹی گئی۔ اس صدمے سے اس کی صحت اور بھی خراب ہو گئی۔ اور اب وہ مستقل طور پر صاحب فراموش ہو گیا۔ ایک مضغۂ گوشت کی طرح پلنگ پر پڑا رہتا۔

ہسپتال میں ربیعہ نے انور کی بڑی خدمت کی۔ رات دن ایک کر دیئے۔ ہر وقت

پلنگ کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔ تیمارداری میں نرسوں کو مات کر دیا۔ کبھی کبھی ساری رات بیٹھ کر گذار دی کبھی کبھی دو دو وقت کھانا نہ کھایا۔ دیکھنے والے اس کی شوہر پرستی پر عش عش کرتے تھے۔ ہسپتال سے جب انور گھر آیا۔ اُس وقت بھی اُس کا یہی معمول رہا خدمت کرتی تسلّی دیتی۔ دل بہلاتی ہمت بندھاتی۔ کتابیں اور اخبار پڑھ کر سناتی۔

غرض اسی طرح وقت گذر رہا تھا کہ انور کی ٹانگ کاٹی گئی۔ اور اس دن کے بعد سے ربیعہ کے رویّہ میں ایک نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اُس نے انور کے پاس بیٹھنا کم کر دیا مگر عموماً گھر ہی پر رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ دن کا زیادہ وقت باہر گذرنے لگا۔ شام کو ٹینس کھیلنے کے لئے جانا ضروری تھا۔ پھر شام کو بھی واپسی دیر سے ہونے لگی۔ اکثر کھانے کا وقت بھی گذر جاتا۔ انور اکیلا پڑا گھنٹوں اس کا انتظار کرتا۔ رات کو وہ کبھی اُس کے پاس آتی اور کبھی نہ آتی —— اور آتی بھی تو تھوڑی دیر بیٹھ کر اور رسمی احوال پرسی کر کے چلی جاتی۔ انور کی حالت قابلِ رحم تھی۔ بے بس مجبور انسان، کسی پر اُس کا زور نہ تھا۔ جی بھر آتا۔ رونے لگتا اور خدا سے موت کی دُعا کرتا۔ مگر موت کی دعا بھی ہمیشہ قبول نہیں ہوتی۔ ربیعہ کے دل میں اُس کے لئے محبّت تو کجا اب رحم کا سرمایہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

ایک دن رات کو ربیعہ کی واپسی میں بہت دیر ہوگئی۔ اس کا انتظار کرتے کرتے انور کی آنکھ لگ گئی۔ سویا تو کسی دوسری دنیا میں تھا۔ دیکھا کہ ربیعہ اور ایک جوان جو غالباً کوئی فوجی افسر تھا۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ندی کے کنارے خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔ انور اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ تڑپ کر

اُس کی آنکھ کھُل گئی اور بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھُلا ربیعہ داخل ہوئی۔ ایک جوان فوجی افسر اُس کے ساتھ تھا۔ اجنبی کو دیکھ کر انور نے جلدی سے آنسو خشک کر لئے۔

ربیعہ نے کہا:۔

آپ ہی ہیں میجر خالد، جن کا میں نے اُس دن آپ سے ذکر کیا تھا۔ آپ کے والد صاحب، ابا جان کے کلاس فیلو تھے۔ کسی سرکاری کام سے آپ پرسوں ایروپلین سے ولایت جا رہے ہیں۔ اور اگر میں جانا چاہوں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں اور خرچ بھی کچھ نہ ہوگا۔ ایک مہینے میں ہم لوگ واپس آ جائیں گے۔ ایک جگہ پڑے پڑے میں گھبرا گئی ہوں۔ تبدیل آب و ہوا بھی ہو جائے گی۔ اور مفت میں لندن کی سیر بھی کر لوں گی۔"

میجر خالد نے کہا "مسٹر انور میں مسز انور کو ہر طرح آرام پہونچانے کی کوشش کروں گا۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

انور یاس و حیرت کی تصویر بنا خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سن رہا تھا۔ اُسے خاموش دیکھ کر ربیعہ نے کہا "تو پھر اجازت ہے نا؟"

انور جیسے خواب سے چونک پڑا۔ وہ سنبھلا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اُس نے کہا "بڑی خوشی سے۔"

انور کا یہ جواب ربیعہ کی توقع کے خلاف اور آرزو کے عین مطابق تھا۔ وہ مسرور

بھی ہوئی اور حیران بھی۔ میجر خالد گڈ نائٹ کہہ کے رخصت ہوئے۔

ربیعہ بیٹھ گئی اور اُس نے ایک مدت کے بعد آج انور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ اور کہا: "کتنے مہربان ہیں آپ" انور نے ایک سرد آہ کھینچی اور زبان سے کچھ نہ کہا اُس کی آنکھیں پھر ایک بار نمناک ہوگئیں۔

رضیہ ان دنوں یہیں تھی۔ دوسرے دن ربیعہ نے اُسے بتایا کہ

"میں کل ایروپلین سے لندن جارہی ہوں"

رضیہ مبہوت ہوکر رہ گئی۔ تھوڑے سے توقف کے بعد اُس نے پوچھا۔

"کس کے ساتھ؟"

ربیعہ نے کہا: "میجر خالد کے ساتھ"

"کون ہیں یہ میجر خالد؟"

"اباجان کے ایک دوست کے بیٹے"

"تم سے کہاں کی جان پہچان ہے؟"

"اتفاقاً کلب میں ملاقات ہوگئی۔"

"کب؟"

"کوئی ایک مہینہ ہوا"

"اور اب تم اُن کے ساتھ ولایت جارہی ہو۔؟"

"ہاں"

غصّے کے مارے رضیہ کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے نہایت تلخ لہجے میں کہا :۔

" ربیعہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہ تم ایک شریف خاندان کی بیٹی اور ایک شریف خاندان کی بہو ہو کر ننگ و ناموس میں اِس طرح آگ لگا رہی ہو۔ للّٰہ کچھ تو سوچو کہ یہ تم کیا کر رہی ہو؟ یہ کیا قیامت ہے؟ کیسا اندھیر ہے؟ کچھ خدا کا خوف کرو۔ کچھ دنیا کی حیا کرو۔ جان قربان کرنے والے شوہر سے یہ بے وفائی ایسی دغا۔ کیا ہوئے وہ تمہارے محبت کے دعوے۔ ہائے افسوس انور کی زندگی میں ۔ ۔ ۔ ۔ "

رضیہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ربیعہ طیش میں آکر بولی :۔

" بس رضیہ بس۔ خدا کا خوف اور دُنیا کی حیا بہت ہو چکی۔ کاش تم مجھے ایک انسان سمجھو۔ گوشت پوست سے بنا ہوا انسان۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھنے والا انسان میں بھی آخر آدمی ہوں سنگین مجسمہ نہیں۔ لوہے کی مشین نہیں ہیں نے کسی کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ کسی کے ساتھ دغا نہیں کی۔ میں نے جس انور سے محبت اور شادی کی تھی وہ ایک خوبرو جوان تھا۔ تندرست و توانا۔ دولت و اعزاز کا مالک۔ قدرت نے اُسے مجھ سے چھین لیا۔ اب وہ دنیا میں موجود نہیں۔ جس انور کا تم ذکر کر رہی ہو وہ ایک کمزور، بیمار، کریہہ المنظر اور اپاہج انسان ہے جو خود دوسروں کا محتاج ہے۔ تم دونوں کو ایک سمجھ رہی ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے۔" یہ کہا اور تیزی کے ساتھ رضیہ کے کمرے سے نکل گئی۔ رضیہ غم و غصّہ اور حیرت و استعجاب کے طوفان

میں ڈوبی ہوئی خاموش بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

دوسرے دن جس وقت ربعیہ ایروپلین میں سوار ہو رہی تھی۔ انور کے ملازم نے ایک سربمہر لفافہ لا کر اُسے دیا۔ ربعیہ نے اُسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا چند منٹ میں ایروپلین روانہ ہو گیا۔ اب وہ اور میجر خالد شانے سے شانہ ملائے زمین سے ہزاروں فیٹ بلند سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضائے بسیط میں اڑے جا رہے تھے۔ ربعیہ نے جیب سے وہ لفافہ نکالا۔ کھول کر ایک نظر ڈالی۔ مسکرائی اور کاغذ خالد کی طرف بڑھا دیا۔ خالد نے پڑھا اور فرطِ مسرت سے بیتاب ہو کر بے اختیار چلا اٹھا:۔

He isa won derfulfellow

وہ عجیب و غریب انسان ہے۔

یہ کاغذ ربعیہ کا طلاق نامہ تھا ٭

سچی کہانی

مصری جادوگر

"جاوید مرحوم نے یہ آپ بیتی اپنے دوست رؤف کو سنائی رؤف نے مجھ سے دہرائی اور میں نے اُسے اپنے الفاظ میں لکھ کر قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔"

پریم پجاری

اتنے بڑے گنجان شہر میں، گلی گلی، کوچے کوچے، محلوں میں، بازاروں میں، دیواروں پر، بجلی کے کھمبوں پر، اکوں کی پشت پر، مزدوروں کے سروں اور سینوں پر، درختوں کے تنوں پر، زمین میں سڑکوں پر، آسمان میں ہوا پہ۔ غرض کوئی ممکن اور ناممکن جگہ ایسی نہ تھی۔ جہاں مصری جادوگر کا اشتہار نظر نہ آئے۔ اور پھر لطف یہ کہ وہ نہ مصری تھا نہ جادوگر، نسلاً انگریز لندن کا رہنے والا۔ نجوم اور پامسٹری جانتا تھا۔ اور کئی سال

مصر میں رہا تھا۔ بس اسی لئے اپنے آپ کو مصری جادوگر کہتا تھا۔ ٹھنڈی سڑک پر اس نے ایک چھوٹا سا بنگلا کرائے پر لے رکھا تھا۔

اس نے اپنا مخصوص کمرہ عجیب وغریب چیزوں سے سجایا تھا۔ اگر اُسے سجانا کہہ سکیں۔ کچھ اِنسانی ڈھانچے، کچھ کھوپڑیاں، کچھ مردہ جانوروں کی ہڈیاں، کچھ زندہ اور مُردہ سانپ، ایک زبردست اژدہا، کچھ سیاہ پردے، ان پر بھیانک تصویریں، کچھ پتّھر کی تراشی ہوئی مورتیں مصر قدیم کی یاد دلانے والی، کچھ بڑے بڑے گھونگے، کوڑیاں۔ سیپیاں، کچھ مونگے کی شاخیں اور سمندر کی تہ سے نکلی ہوئی دوسری عجیب وغریب چیزیں خود ایک بڑا سا ڈھیلا ڈھالا سفید، براق چغہ پہنتا تھا۔ اور سر پر تہ کی ہوئی چھوٹی سی پگڑی۔ وہ بھی سفید رنگ کی۔

اس کے کمرے میں پہنچتے ہی اِنسان ایسا محسوس کرتا تھا جیسے کسی اَن دیکھی دنیا میں آگیا۔ دن کے وقت بھی وہاں اچھا خاصا اندھیرا رہتا تھا۔ دودھیا فانوس میں صرف ایک موم بتی میز پر جلتی ہوئی۔ فانوس پر جالی کا سیاہ پردہ پڑا ہوُا۔ یہ دھندلی روشنی کمرے کی فضا کو کچھ اور بھی بھیانک بنا دیتی تھی۔ جیسے اب کوئی بھوت کسی کونے میں سے جھپٹا۔ اب کسی جن نے چھت میں سے سر نکالا۔ اب کوئی دیوار شق ہوئی اور کوئی بلا اس میں سے نکل کر دوڑی اور سچ پوچھئے تو مصری جادوگر خود بھی اِس فضا میں کسی طرح ایک بھوت سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر بچے بچے کی زبان پر مصری جادوگر کا نام تھا۔ نوروپے

میں آدھا اور سترہ روپے میں قسمت کا پورا حال بتاتا تھا۔ ہندوستان کے لحاظ سے فیس تو بھاری تھی مگر رجوع خلائق کا یہ حال کہ کسی وقت اُسے فرصت ہی نہ تھی۔ ایک جاتا تھا ایک آتا تھا۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اس کے کمال کی گرویدہ تھیں۔ جہاں تک مذہبی تعلیمات کا تعلق ہے۔ اسلام کو واہمہ پرستی سے بیر ہے لیکن مصری جادوگر کے یہاں جانے والے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے کچھ کم نہ تھی۔ لوگ کہتے تھے "مصری جادوگر جو کچھ بتاتا ہے وہ سو فیصدی صحیح ہوتا ہے۔"

جاوید کی عمر اُس وقت انیس ۱۹ برس کی تھی۔ اچھا سجیلا جوان تھا۔ لڑکپن میں کئی سال تک بیمار رہا۔ اس لئے اس کی تعلیم میں بہت تاخیر ہو گئی۔ اسی سال انٹرنس پاس کیا تھا اور کالج میں داخل ہونے کا ارادہ کر رہا تھا طبیعت بہت رسا پائی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے والد بیس برس تک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر رہ چکے تھے۔ سارا نہیں تو آدھا شہر ضرور اُن کا شاگرد تھا۔ اس لئے شہر کے اکثر معزز لوگ جاوید کو جانتے تھے۔ اور کتنے ہی خوشحال ہندو اور مسلمان گھرانوں میں اُس کا آنا جانا تھا۔

مختلف لوگوں کے ساتھ کئی مرتبہ جاوید کو مصری جادوگر کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا جانے مصری جادوگر کو جاوید کی شائستگی پسند آئی یا خوش گفتاری و شگفتہ مزاجی بہرحال وہ جلد ہی جاوید پر کچھ اس طرح مہربان ہو گیا۔ جیسے ایک شفیق بزرگ اپنے کسی سعادت مند خورد پر ہوتا ہے۔ ایک دن اُس نے جاوید سے کہا۔

"جاوید! تم نے اپنا ہاتھ آج تک مجھے نہیں دکھایا۔ اپنا زائچہ کیوں نہیں بنوا لیتے؟"

جاوید نے کہا: "جی تو میرا کئی بار چاہا۔ مگر میرے پاس سترہ روپے کہاں تھے جو آپکی نذر کرتا اور زائچہ بنواتا۔"

"خیر تم روپیوں کی فکر نہ کرو۔" مصری جادوگر نے کہا۔ کل میں تمہارا ہاتھ دیکھوں گا۔ اور صرف چند باتیں تمہیں بتاؤں گا۔ ایسی باتیں جن پر تمہاری زندگی کی برائی بھلائی کا انحصار ہے۔"

دوسرے دن حسب وعدہ مصری جادوگر نے جاوید کا ہاتھ دیکھا اور کہا: "جو کچھ میں کہتا جاؤں تم لکھتے جاؤ۔ لکھو۔"

جاوید نے لکھنا شروع کیا۔

(۱) بی۔ اے کے امتحان میں تم یونیورسٹی میں فرسٹ آؤ گے۔"

"مگر والد صاحب کا ارادہ تو یہ ہے کہ میں ایف۔ ایس، سی پاس کر کے ڈاکٹری پڑھوں۔" جاوید نے مصری جادوگر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تمہارے والد صاحب کی خواہش یا ارادہ تقدیر کے نوشتے کو نہیں بدل سکتا۔ تمہیں بی۔ اے پاس کرنا ہے اور یونیورسٹی میں اوّل آنا ہے۔" مصری جادوگر نے یقین کے ساتھ کہا۔ "تم درمیان میں نہ بولو۔ بس جو کچھ میں کہوں تم لکھتے جاؤ۔ لکھو۔"

جاوید نے پھر لکھنا شروع کیا۔

(۲) "تمہاری شادی چوبیس سال کی عمر میں ہو گی۔"

جاوید پھر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر مصری جادوگر نے کچھ اس انداز سے اسکی طرف دیکھا

کہ وہ خاموش ہی رہ گیا۔ مصری جادوگر پھر بولا۔

(۳) "تمہاری شادی ایک خوبصورت غیر مسلم لڑکی سے ہوگی۔"

"قطعاً ناممکن ہے۔" جاوید اچانک بول اُٹھا۔ "میری خالہ زاد بہن سے میری منگنی ہو چکی ہے۔" اور اسی سال ہماری شادی ہو جائے گی۔"

"مجھے اس سے کچھ بحث نہیں کہ کیا ہو چکا ہے۔" مصری جادوگر نے ذرا ترشی کے ساتھ کہا: "میں تمہیں صرف وہ باتیں بتا رہا ہوں جو ہونے والی ہیں۔ جو ہو کر رہیں گی۔ اور جنہیں دنیا کی کوئی طاقت نہ روک سکتی ہے نہ بدل سکتی ہے۔ اچھا اب تم بار بار بیچ میں نہ بولو۔ چلو لکھو۔

جاوید مصری جادوگر کی یہ باتیں سُنکر عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ اُس نے پھر لکھنا شروع کیا۔

(۴) "تم ایک بہت بڑی دولت کے مالک بنو گے۔"

مصری جادوگر کی یہ بات سُن کر جاوید ایک نہایت معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ مصری جادوگر نے اس کی مسکراہٹ میں بے اعتمادی کو اچھی طرح بھانپ لیا۔ اُس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

" جاوید! وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا۔ تم ابھی سے بدگمان نہ ہو۔ قدرت کے بھید ہر شخص نہیں جانتا۔ جو میں دیکھ سکتا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے۔ تم بھی دیکھ سکو گے مگر ابھی نہیں۔ وقت آنے پر۔ اس لئے جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا یقین کرو۔ اور میں کیا کہتا

ہوں۔ جو کچھ کہتی ہیں تمہارے ہاتھ کی لکیریں کہتی ہیں۔ تمہارے ستارے کہتے ہیں۔ یاد رکھو میں اور تم جھوٹ بول سکتے ہیں مگر یہ لکیریں اور یہ ستارے کبھی غلط نہیں کہتے۔ یہ قدرت کے رازوں کی کنجیاں ہیں۔ میری طرح اگر تم بھی ان کنجیوں کا استعمال جانتے تو آج مستقبل کو اسی طرح بے نقاب دیکھ سکتے۔ جس طرح حال کو دیکھ رہے ہو۔ تمہارے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ تم بہت خوش نصیب انسان ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔"

"اچھا صرف ایک بات اور بتا دیجئے۔" جاوید نے منّت سے کہا۔

"پوچھو" مصری جادوگر نے جواب دیا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر یہ دولت مجھے ملے گی کہاں سے۔"

"بیوی سے۔"

جاوید خدا حافظ کہہ کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مصری جادوگر کی باتوں نے اس کے دماغ میں ایک نئی رومانی دنیا ایجاد کر دی تھی۔ جس میں رنگینیاں ہی رنگینیاں مسرتیں ہی مسرتیں تھیں آنیوالی کامرانیوں کا نشہ ابھی سے اس کے حواس پر چھایا جا رہا تھا۔ گوناگوں جذبات اس کے سینے میں امنڈ رہے تھے۔ کبھی کبھی اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ شاید اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ کبھی چلتے چلتے بالکل غیر شعوری طور پر اس کے قدم سست پڑ جاتے کبھی رفتار تیز ہو جاتی۔ اپنی خیالی دنیا کے سوا اس وقت بیرونی دنیا کی اور کوئی چیز اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ غرض طرح طرح کے منصوبے باندھتا اور آئندہ زندگی کو خیالی طور پر حسب مراد ترتیب دیتا ہوا گھر پہنچا۔

سارا دن ایک عجیب قسم کے ذہنی ہیجان میں گذرا۔ امید و بیم میں جنگ ہو رہی تھی مگر امید کا پلّہ بھاری تھا۔ وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ رات آئی اور دن کا ہنگامہ اور شور و شغب موقوف ہوا۔ تو مستقبل کے رنگین خوابوں نے اُسے بالکل ہی مسحور کر دیا۔ وہ بیدار تھا۔ مگر خواب دیکھ رہا تھا بہت ہی انوکھے اور ولولہ انگیز خواب۔ ہاں کبھی کبھی ناکامی کا خوف دل کی تہوں میں سے اس طرح ابھرتا کہ وہ کانپ اُٹھتا۔ وہ جی میں کہتا۔

"یہ ساری باتیں اَن ہونی ہیں۔ ایک خوبصورت غیر مسلم لڑکی سے شادی اور کثیر دولت! میں اتنا خوش نصیب کہاں۔ مصری جادوگر نے مجھے بیوقوف بنایا۔ میرا دل خوش کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہہ دیا۔ ہماری تو سات پشتوں میں بھی کوئی بڑا دولت مند نہیں گذرا۔ سب ہی معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میری حالت اپنے بزرگوں سے کچھ بہتر ہو جائے۔ مگر کثیر دولت! ناممکن اور قطعی ناممکن۔ آخر دولت آئے گی کہاں سے؟ بیوی اپنے ساتھ لائے گی؟ ضرور لائی، بیوی اپنے ساتھ۔ اوّل تو یہ ممکن ہی نہیں۔ کہ کسی غیر مسلم امیر کبیر کی بیٹی مجھ سے شادی کرے۔ آخر مجھ میں ایسے کیا لال لگے ہیں۔ ہاں نو کسی سادہ دل لڑکی کو مجھ سے محبت ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کرلے۔ مگر ایسی حالت میں تو اُسے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ملے گی۔ نہیں جی یہ سب خرافات ہے۔"

لیکن امید دل کے سنہری محل اس طرح مسمار ہوتے دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگتی اور وہ کامیابی کے دوسرے امکانات پر غور کرنے لگتا۔ وہ اپنے دل میں کہتا، "مگر خدا میں

سب کچھ قدرت ہے۔ شاید وہ کوئی ایسی صورت پیدا کر دے جو اس وقت میرے دماغ میں نہیں آتی۔ شاید کسی اللہ والے کی دعا سے میرے لئے غیبی خزانوں کے دروازے کھل جائیں۔" مگر پھر اچانک اُسے خیال آتا کہ یہ تو پُرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ ایسے اولیاء اللہ کہاں کہ ایک نظر میں گداگر کو تونگر بنا دیں۔ آج کل کے پیر فقیر تو اپنی دعا یا بددعا سے لوگوں کو فقط نقصان ہی پہنچا سکتے ہیں۔ اشرفیوں سے کسی کی جھولی بھر دینا ان کے بس کی بات نہیں۔" اور پھر اس کا دل نراس ہونے لگتا۔ پھر یکایک امید کا چراغ آپ ہی آپ اسکے دل میں روشن ہو جاتا۔ وہ کہتا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ میری ہونے والی بیوی کوئی یتیم لڑکی ہو۔ کثیر دولت اس نے ترکے میں پائی ہو۔ اور وہ خود اپنی مرضی کی مالک و مختار ہو۔" اس خیال سے اس کے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی۔ مسرت سے اس کا چہرہ دمکنے لگتا۔ بے اختیار لبوں پہ مسکراہٹ آجاتی اور وہ دفعتہً ایک رومانی دنیا میں پہنچ جاتا اس کے خیالات کی ٹرین پھر چل پڑتی۔ وہ سوچتا یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری شادی ایک رومانی شادی ہوگی۔ محبت اپنا معجزہ دکھائے گی۔ ورنہ ایک غیر مسلم لڑکی کو مجھ سے کیا سروکار۔ اور یہ بھی یقینی ہے کہ اُسے مجھ سے بے پناہ محبت ہوگی۔ ورنہ وہ اتنی عظیم الشان قربانی کیونکر کر سکتی ہے کہ میری خاطر اپنے مذہب، اپنے اعزّہ اپنی سوسائٹی سب کو خیرباد کہہ دے۔ ساری دُنیا کی ملامتیں سُنے اور خوشی سے برداشت کرے۔ ہاں، اِنسان جب اپنے دل سے مجبور ہو جائے تو سب کچھ سہہ لیتا ہے۔

"دولت اور حُسن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس لڑکی نے دولت و عشرت کی

چھاؤں میں پرورش پائی ہو اور ہمیشہ ناز و نعمت کے گہواروں میں جھولتی رہی ہو - ظاہر ہے کہ وہ کتنی نازک، کتنی پیاری، کتنی موہنی ہوگی"۔ اور پھر وہ اس موہنی کی ایک خیالی تصویر اپنے تخیّل کی مدد سے کھینچتا "بلند قامت، چھریرا بدن۔ پھولوں کی ڈالی کی طرح لچکنے والی۔ گھونگھر والے بال۔ کتابی چہرہ۔ نمکین گندمی رنگ۔ بس گندمی سے زیادہ گورا نہیں پھیکا شلجمی کس کام کا۔ ستواں ناک۔ بڑی بڑی سیاہ غزالی آنکھیں۔ لمبی لمبی گھنی ریشمیں پلکیں۔ باریک قوسی ابرو پتلے پتلے گلابی ہونٹ، چھوٹا سا دہانہ۔ خوبصورت۔ خوش آب بتیسی"۔ اور اس پیکرِ جمال و رعنائی کو عالم خیال میں اپنے سامنے کھڑا آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا۔ دیکھ کر وہ فرطِ مسرت سے بے تاب ہو جاتا۔ اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ پھر وہ سوچتا خدا جانے یہ خوش رنگ کلی کسی باغ میں پھول بن رہی ہے میں اُسے کہاں ڈھونڈوں اور کیونکر پاؤں۔

خیال کا جادوگر پھر ایک طلسمی نظارہ آنکھوں کے سامنے لاتا۔ ایک عالی شان پیلیس شاید سمندر کے کنارے یا کسی پرفضا وادی میں یا کوہستان شملہ کی بلندیوں پر۔ چاندنی میں نہایا ہوا۔ پھولوں سے لدا ہوا۔ عیش و راحت کے سامانوں سے سجا ہوا خوش رنگ وردیاں پہنے ہوئے درجنوں ملازم اور خادمائیں۔ ہر طرف چہل پہل، گھما گھمی اور اس "فردوس بر روئے زمین" کے ایک نہایت آراستہ کمرے میں جاوید اور اس کے پہلو میں اس کے دل کی رانی، سراپا بہار بنی، کیف آگیں تبسم کے پھول برساتی ہوئی"۔ یہاں تک پہنچ کر جاوید پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اسکی آنکھیں

بند ہونے لگتیں اور بے اختیار ایک لمبی سی اُف اسکے منہ سے نکل جاتی۔

غرض وہ اسی طرح کے خواب دیکھتا رہا۔ کئی بار سویا اور کئی بار جاگا۔ مگر خوابوں کا سلسلہ دونوں حالتوں میں برابر جاری رہا۔ صبح کو جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک خاص قسم کا سرور وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے خیالات پھر چل نکلے۔ آج وہ اپنے لئے ایک خاص پروگرام بنا رہا تھا۔ پہلا فیصلہ تو اس نے یہ کیا کہ انٹرمیڈیٹ میں سائنس کے بجائے آرٹس کے مضامین لے۔ جب بی۔ اے کرنا پہلے سے مقدر ہو چکا ہے تو ڈاکٹری پڑھنے کے خیال سے ایف ایس سی میں داخلہ کرانے کے کوئی معنی نہیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ والد صاحب اس معاملے میں ضرور اس کی مخالفت کریں گے لیکن والدہ کی حمایت پر اُسے بھروسا تھا۔ اور وہ یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ ماں کی مدد سے باپ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

دوسرا اہم فیصلہ یہ تھا کہ آج سے جہاں تک ہو سکے بہترین لباس پہننا چاہئے اور ہمیشہ نہایت ٹپ ٹاپ (TIP TOP) رہنا چاہئے۔ مثل مشہور ہے کہ "الناس باللباس" لباس ہی سے آدمی آدمی بنتا ہے۔ دنیا ظاہر کو دیکھتی ہے۔ لہذا کسی کی توجہ کو جذب کرنے کے لئے ظاہر کی آراستگی ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔ خدا جانے کب اور کہاں اُس "جانِ آرزو" کا سامنا ہو جائے۔ اس فیصلہ کے مطابق اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ شہر کے بہترین ہیر کٹنگ سیلون میں جا کر بال ترشوائے اور رمے کمپنی سے دو نئی ٹائیاں اور ایک ولائتی جوتا خریدا۔

دوسرا مرحلہ کالج میں داخلے کا تھا۔ باپ کو راضی کرنا تھا کہ وہ آرٹس کے مضامین لینے کی اجازت دے دیں۔ جاوید نے پہلے اپنی ماں سے ذکر کیا۔ اُس نے کہا سائنس میں نے انٹرنس میں پڑھی تو ضرور ہے مگر مجھے اِس مضمون سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ مشکل سے پاس ہؤا ہوں۔ اب اگر ایف۔ اے میں بھی سائنس لے لی۔ تو قطعی فیل ہو جاؤں گا۔ وقت بھی برباد ہو گا اور پیسہ بھی۔ اس کے علاوہ ابّا جان ڈاکٹری پڑھانا چاہتے ہیں اور چیر پھاڑ سے مجھے دلی نفرت ہے وہاں سارا کام اسی کا ہے میں تو کسی کے انجکشن لگتا دیکھتا ہوں۔ تو جھرجھری سی آجاتی ہے۔ آپریشن کون کریگا۔ جب یہ حال ہے تو ڈاکٹری پڑھنے کا حاصل؟ آرٹس کے مضامین لے کر بی۔ اے کر لوں گا۔ تو اس کے بعد وکالت پڑھ سکتا ہوں۔ نہایت آزاد پیشہ ہے۔ اچھے وکیل یوں بھی کچھ کم نہیں کماتے۔ اور اگر نوکری ہی کرنا چاہیں تو منصف اور جج تک ہو سکتے ہیں۔

ماں کو بیٹے کی یہ رائے پسند آئی۔ اتفاق سے ان کے ایک ماموں سب جج رہ چکے تھے۔ بڑے بڑے مقدمے اُنہوں نے فیصل کئے تھے۔ شہر میں ان کا بڑا نام تھا۔ جاوید کی ماں کی نظر میں سب ججی کا عہدہ کمشنری سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کچھ لڑ جھگڑ کر، کچھ منت سماجت سے کچھ سمجھا بجھا کر جاوید کے والد کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ جاوید کو ڈاکٹری پڑھانے کا خیال چھوڑ کر بی۔ اے کرنے دیں تاکہ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد وکالت پڑھے۔ پھر وکیل بنے۔ پھر منصف ہو اور بالآخر جج کہ اس سے زیادہ بڑا اور

معزز کوئی اور عہدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھتا ہے وہ گویا خدا کا قائم مقام ہوتا ہے۔ زہے نصیب اس شخص کے جس کو یہ رتبہ ملے۔

جاوید اسی ہفتہ آرٹس کے مضامین لے کر کالج میں داخل ہو گیا۔ اسے اپنی تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ کیونکہ مصری جادوگر کی پیشین گوئی کے مطابق بی۔ اے میں اسے یونیورسٹی بھر میں اوّل آنا تھا۔ اس شاندار کامیابی کے لئے پوری تیاری ابھی سے ضروری تھی۔ وہ اپنی تمام تر توجہ مطالعہ میں مرکوز کر دینا چاہتا تھا۔ مگر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ بار بار اس کا خیال اُس پیکر زیبائی کی طرف جاتا تھا جسے اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور دیکھنے کا بے انتہا آرزومند تھا جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ جسے وہ ہر جگہ ڈھونڈھتا تھا اور کہیں نہ پاتا تھا۔ خالہ کی بیٹی رضیہ یعنی اپنی منگیتر میں جو ایک مدت سے اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اب اس کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ اور ایک رضیہ ہی کیا اب کوئی مسلمان لڑکی خواہ وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو اس کے لئے کسی دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کسی غیر مسلم لڑکی کا منتظر تھا جو اچانک کہیں سے نمودار ہو کر اس کی ساری زندگی پر چھا جائے۔

مگر وہ غیر مسلم دوشیزہ کون ہو سکتی تھی؟ کوئی عیسائی لڑکی؟ نہیں دیسی عیسائی لڑکیوں سے اسے للّٰہی بغض تھا۔ وہ ان کی کالی کالی صورتیں اور پتلی پتلی ٹانگیں۔ اس پر فرنگنوں کا سا لباس دیکھ کر سخت ہی جھلّاتا تھا۔ تو پھر کوئی انگریز لڑکی؟ نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں انگریز لڑکیاں ہندوستانی لڑکوں سے دوستی اور شادی نہیں کیا

کرتیں۔ اچھا تو کوئی ہندو لڑکی ؟ ہاں کوئی ہندو لڑکی۔ اسی لئے اب اس کا میل ہندو گھرانوں میں زیادہ ہو گیا تھا۔ فطرتاً وہ شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اسی لئے کہیں ابتدا کرنے کی جرأت اس میں نہ تھی۔ کئی ہندو لڑکیوں سے صاحب سلامت ہوئی۔ بعض سے مکرر ملنا ہوا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

وہ اچھے سے اچھا لباس پہن کر خوب بن سنور کے گھر سے نکلتا۔ بازار جاتا۔ مال روڈ کا چکر لگاتا ہوا گھاٹ پر جا نکلتا۔ سینما دیکھتا۔ کوشش کر کے شادیوں اور پارٹیوں میں شریک ہوتا۔ کبھی کوئی لڑکی بالقصد یا بلا ارادہ اس کی طرف دیکھ لیتی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس وقت وہ یہ بھی نہ سوچتا کہ وہ خوبصورت اور بظاہر دولت مند ہے یا نہیں ہاں اگر وہ مسلمان یا عیسائی ہوتی تو اس کا اضطراب فوراً سکون پذیر ہو جاتا۔

شہر میں کارنوال آیا ہوا تھا۔ جاوید بھی کئی بار دیکھنے گیا۔ آخری دن ایک بوڑھا سکھ اور اس کے ساتھ ایک شوخ طرار، خوبصورت لڑکی، جاوید کے برابر سے گذرے۔ لڑکی نے ایک خاص انداز سے جاوید کو دیکھا۔ ذرا ٹھٹکی، پھر آگے بڑھ گئی۔ اور کئی بار پلٹ پلٹ کر دیکھا۔ جاوید کے دل میں بجلیاں کوند گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ اس آہوئے رم خوردہ کا تعاقب کرے مگر وہی طبعی حجاب مانع آیا دل مسوس کر رہ گیا۔ مگر اس کا پیچھا نہ کیا۔ چند ہی روز بعد شہر میں نمائش شروع ہو گئی۔ جاوید وہاں بھی تقریباً ہر روز جاتا تھا خیال تھا کہ شاید اس غزال رعنا سے پھر مڈبھیڑ ہو جائے اور اس کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی لڑکی زرق برق لباس پہنے اپنی کئی سہیلیوں کے ساتھ چکر

کی طرح تنتی ہوئی. سامنے سے چلی آرہی ہے۔ آج وہ بڈھا سکھ اس کے ساتھ نہ تھا جاوید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جیسے ہی اس کی نظر جاوید پر پڑی۔ اس نے آہستہ سے اپنی ایک سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔ سہیلی نے بھی گردن اٹھا کر جاوید کی طرف دیکھا۔ جاوید کے دل کی حرکت اور بھی تیز ہو گئی۔ آنِ واحد میں "تیلیوں" کی یہ ٹکڑی جاوید کے بالکل قریب آپہنچی جاوید کے پاؤں بوجھل ہو گئے۔ قدم نہ اُٹھتے تھے۔ دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ برابر ہی چوڑی والے کی دکان تھی۔ وہاں یہ لڑکیاں ٹھہر گئیں اور سچ مچ یا جھوٹ موٹ چوڑیاں خریدنے لگیں۔ جاوید نے بھی ہمت کر کے وہیں قدم جما دیئے۔ وہ لڑکی بار بار بڑی ہی پُر شوق اور تعجب آمیز نگاہوں سے جاوید کو دیکھتی تھی۔ اور پھر چوڑیاں خریدنے میں مشغول ہو جاتی تھی۔ جاوید کی نظریں برابر اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

اس لڑکی کی ایک سہیلی نے مسکرا کر آہستہ سے کچھ کہا۔ جاوید نے سنا تو۔ مگر سمجھا کچھ نہیں۔ وہ گھبرا سا گیا۔ اتنے میں ایک جوان سکھ بھی وہاں آپہنچا۔ لڑکی نے آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ سکھ جوان جاوید کی طرف بڑھا اور نہایت شائستگی اور نرمی کے ساتھ کہا: "کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

ایک مبہم سا خوف جاوید پر طاری ہو گیا۔ اس نے کہا: "میرا نام؟ میرا نام ....

جاوید ہے" سکھ جوان نے کہا: "شکریہ" پھر اس لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ سے ملو۔ آپ ہیں جاوید صاحب" پھر جاوید سے خطاب کر کے کہا: "جاوید صاحب!

یہ ہے میری بیوی۔ آپ کو اس طرح کے تعارف سے تعجب تو ضرور ہوا ہوگا۔ مگر میں اس کی وجہ آپ کو بتا دوں۔ اس کا ایک ہی بھائی ہے۔ مہندر سنگھ بالکل آپ کی صورت عمر بھی تقریباً اتنی ہی یا شاید ایک آدھ سال آپ سے بڑا ہو۔ اتنا ہی قد و قامت۔ کوئی تین مہینے ہوئے گھر سے خفا ہو کر کہیں چلا گیا۔ آج تک اُس کا پتہ نہیں۔ اکلوتا بھائی ہے یہ اُس کے لئے روتے روتے مری جاتی ہے۔ اس نے آپ کو ایک دن کاریڈال میں دیکھا آپ کی صورت مہندر سے اس قدر ملتی جلتی ہے کہ اُسے ایک لمحہ کے لئے آپ پر مہندر کا شبہ ہو گیا تھا۔ واپس آکر مہندر کو یاد کر کے دو گھنٹے روتی رہی۔"

سکھ جوان کہہ رہا تھا۔ جاوید نے دیکھا کہ آنسوؤں کے دو قطرے اس لڑکی کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔ جاوید نے حقیقت حال کو اب سمجھا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی اُس نے سمجھا تھا کہ شاید وہ طائر بہشتی یہی ہے جس کی تلاش میں وہ ہر وقت محبت کا جال لئے سرگرداں پھرتا ہے۔ مگر نہیں۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

غرض تین مہینے کے اندر جاوید کو ایسے کئی واقعے پیش آئے اور ہر مرتبہ اُسے شدید مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی شدتِ احساس تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی تلاش میں اب پہلے سے زیادہ سرگرمی پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ اپنی نادیدہ، نامعلوم بلکہ موہوم محبوبہ کے لئے اب ہر وقت پہلے سے کہیں زیادہ بے چین رہنے لگا تھا۔

کالج میں داخل ہوئے جاوید کو کئی مہینے گذر چکے تھے۔ اس کی جماعت میں کئی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ سب گھنٹا بجنے اور پروفیسر کے آجانے کے بعد کلاس میں

داخل ہوتی تھیں۔ اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی پروفیسر کے ساتھ کلاس سے نکل جاتی تھیں۔
ان کی نشست بھی لڑکوں سے علیحدہ سب سے اگلی بنچ پر تھی۔ اس لئے شاذو نادر ہی
ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کسی لڑکے کو کسی لڑکی سے بات کرنے کا موقع مل سکے اور جاوید
تو یوں بھی بہت شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اپنی طرف سے پہل کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

لڑکیوں میں اتفاق سے بدشکل تو کوئی نہ تھی۔ لیکن ایک پارسی لڑکی خاصی قبول
صورت تھی۔ جاوید کا جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کرے۔ لیکن ہمت نہ پڑتی تھی۔

انہیں دنوں کہیں کوئی سیاسی ہنگامہ ہوا۔ دوپہر کے وقت کانگریس کے لیڈروں
نے مٹی کے تیل کا پیپا بجا کر ہڑتال کا اعلان کیا۔ ذرا سی دیر میں تمام دوکانیں بند ہو گئیں
کارخانوں کے مزدوروں نے باقی آدھے دن کی ہڑتال کر دی۔ اکثر سکولوں میں چھٹی
ہو گئی، جاوید کا کالج کھلا ہوا تھا۔ پڑھائی ہو رہی تھی۔ اسکول کے لڑکوں کا ایک غول
ادھر بھی آنکلا۔ اور کالج کے کمپاؤنڈ میں کھڑے ہو کر زور زور سے "بندے ماترم" اور
"مہاتما گاندھی کی جے" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکے
کلاسوں سے نکل آئیں اور کالج بند ہو جائے۔ مگر کالج والوں کو بھی کچھ ضد سی ہو گئی
تھی وہ دوسروں کی زبردستی سے کالج بند کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔

جاوید کی نشست دروازے کے قریب تھی۔ پروفیسر نے کہا "جاوید! دروازہ
بند کر دو" جاوید نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ لڑکوں نے اب اور بھی زیادہ شور وغل
مچایا۔ ایک لڑکے نے دروازہ پر آ کر گھونسے مارنے شروع کئے۔ پھر ایک اینٹ کہیں سے

اٹھالایا اور دروازے کے شیشے میں مارا شیشہ چور چور ہو گیا۔ اور اس کے کچھ ٹکڑے اڑ کر بنچ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی پارسی لڑکی کے جا کر لگے۔ جاوید کو تاؤ آ گیا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا اُٹھا دروازہ کھولا اور شیشہ توڑنے والے لڑکے کو۔ گردن پکڑ کے برآمدے کے نیچے دھکیل دیا۔ اور دروازہ بند کر کے پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

لڑکے کا برآمدے کے نیچے گرنا تھا کہ قیامت آ گئی۔ تمام لڑکوں نے اس دروازے پر ہلا بول دیا۔ پروفیسر صاحب گھبرا گئے۔ انہوں نے لڑکیوں سے کہا "تم لوگ پرنسپل کے کمرے میں چلی جاؤ" اور جاوید سے کہا۔ جاوید تم انہیں پرنسپل کے کمرے میں پہنچا دو۔ جاوید نے کہا "بہت اچھا" وہ آگے آگے، لڑکیاں پیچھے پیچھے پرنسپل کے کمرے کی طرف چلے۔ اس دروازے کے باہر ایک بنچ راستے میں حائل تھی۔ جاوید نے اُسے ہٹانا چاہا مگر ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے ہٹا نہ سکا۔ وہ پلٹا اور نظر اٹھائے بغیر کتابیں قریب والی لڑکی کے حوالہ کیں۔ اور دونوں ہاتھوں سے بنچ کھسکا کر راستہ کھولا۔ اتنے میں مخالف لڑکوں کا غول اُدھر سے اِدھر آ پہنچا۔ جاوید جلدی سے لڑکیوں کو ساتھ لے پرنسپل کے کمرے میں پہنچا۔ اختصار کے ساتھ سارا ماجرا پرنسپل کو سنایا اور خود برابر کے دروازے سے نکل اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ اسکول کے لڑکوں سے کالج کے لڑکوں کی ایک جھڑپ ہوئی مگر فوراً ہی کالج میں چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ فتنہ فرو ہو گیا۔ سب نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ اس عجلت اور گھبراہٹ میں جاوید اس لڑکی سے اپنی کتابیں لینا بھی بھول گیا۔

سوء اتفاق کہو یا حسنِ اتفاق اسی دن جاوید کو بخار آ گیا۔ اور وہ دو دن تک بستر سے

نہ اُٹھ سکا۔ تیسرے دن صبح ہی صبح کسی نے دروازہ پر کھٹکا کیا معلوم ہوا کوئی چپراسی ہے کہیں سے کتابیں لایا ہے اور ایک خط بھی یخط انگریزی میں تھا۔ اس میں لکھا تھا:-

ڈیر مسٹر جاوید!

" اس دن جلدی میں آپ اپنی کتابیں مجھ سے لینا بھول گئے۔ اور پھر اس ہنگامے میں مجھے بھی اتنا موقع نہ ملا کہ واپس کر دیتی۔ اگلے دن آپ کی کتابیں کالج لے کر گئی۔ مگر آپ سے ملاقات ہی نہ ہوئی۔ پھر گھر واپس لے آئی۔ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد یہ آپ تک پہنچ جائیں تاکہ آپکے مطالعے کا حرج نہ ہو۔ اتفاق سے آپ کی ایک کاپی بک پر آپ کا پتہ لکھا ہوا نظر پڑ گیا۔ اسی پتہ پر آپ کی کتابیں بھیج رہی ہوں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں" فقط

مخلص (شیریں) مس سہراب جی

مزید: "ہاں اس دن آپ نے ہم لوگوں کی بڑی مدد کی۔ دلی شکریہ قبول فرمایئے"۔

جاوید نے مختصر سا جواب لکھ کر چپراسی کے حوالہ کیا اور کہا کہ "مس صاحبہ سے کہہ دینا مجھے بخار آ گیا تھا۔ اس لئے کالج نہ آسکا۔ کل آؤں گا"۔

چپراسی چلا گیا۔ جاوید پر ایک شدید قسم کی رومانیت طاری ہو گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل کے اندر سے پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ جاوید یہی ہے وہ گوہر گراں مایہ جس کی تمہیں تلاش تھی۔ یہیں سے تمہارے رومان کا آغاز ہوگا اور ہوگا کیا معنی۔ ہو گیا

پہل بھی اُدھر ہی سے ہوئی۔ ورنہ تمہارے کئے کچھ نہ ہوتا۔ مگر اب اس دُرِ شہوار کو حاصل کرنا تمہارا کام ہے۔ قدرت نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

شیریں کے خط کو اس نے کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ بے اندازہ مسرور رہا۔ خط میں کوئی بات بھی ایسی نہ تھی۔ جس کی بنا پر جاوید اپنی امیدوں کا دامن اس قدر پھیلا سکتا۔ بالکل سیدھا سادہ رسمی خط تھا۔ مگر اندھے کیوپڈ کا تیر کمان سے چھوٹ کر جاوید کے دل میں نماز دہ ہو چکا تھا۔ آج وہ مصری جادوگر کی پیشین گوئی کو وحی والہام سے کہیں بڑھ کر سمجھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر اس کے لئے ایک روح پرور رومانی دنیا عدم سے وجود میں آ گئی تھی۔ اس نے کہا۔

"کتنا پیارا نام ہے شیریں۔ دنیا کے بہترین رومان کی زیبا ترین ہیروئن خسرو پرویز کی روح کی تسکین۔ نازش ایران۔ آشوبِ روزگار۔ پھر اصل نسل بھی وہی۔ وہ بھی ایرانی تھی۔ یہ بھی ایرانی ہے۔ اصلی ایرانی پارسی ہی تو ہیں۔ اور پھر کتنی وفا پرست تھی۔ ایران کی وہ شاہ بانو اپنے پرستار فرہاد کے لئے خود بھی قبر کے آغوش میں جا سوئی۔ کیا میری شیریں اس سے کم وفا پرست ہو گی؟ کبھی نہیں۔ مگر خدا و ندا۔ کہیں میرا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو۔ جیسا کوہکن کا ہوا۔"

اس خیال کے آتے ہی وہ لرز گیا۔ مگر پھر اُس نے خود کو سنبھالا اور کہا "نہیں مجھے اس قسم کے واہموں کو اپنے دل میں راہ نہ دینی چاہئے۔ مصری جادوگر سچ کہتا تھا کہ ہاتھ کی لکیریں جھوٹ نہیں بولتیں۔ قسمت کے ستارے غلط نہیں کہتے۔ سب نے مل کر میرے

لئے ایک شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کی ہے۔ ایسا مستقبل جس میں مسرتیں ہی مسرتیں راحتیں ہی راحتیں ہیں۔" پھر اُس نے شیریں کا خط نکالا اور ایک سانس میں پڑھ ڈالا۔

"کتنا پیارا خط ہے۔" اُس نے اپنے دل میں کہا: "عبارت کتنی ستھری، خیالات کتنے پاکیزہ اور طرز بیان کس قدر معصومانہ۔ کتنی زحمت کی میری خاطر۔ پھر حال بھی پوچھا۔ اور شکریہ بھی ادا کیا۔ کتنی نیک دل اور شرافت مند ہے یہ لڑکی۔ خدا راس لائے۔ مگر خدا جانے میرا دل آپ ہی آپ کیوں سہما جاتا ہے۔"

جانے کے قابل ہوتا تو جاوید اسی دن کالج چلا گیا ہوتا۔ مگر وہ ابھی کمزور تھا اور بخار کی خفیف سی حرارت بھی باقی تھی۔ پھر بھی اُس نے ایک بار ہمت کر کے کالج جانے کا ارادہ کیا۔ مگر ماں نے سختی سے روک دیا۔ وہ سارے دن اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا۔ کہ کل شیریں سے ملاقات ہوگی تو کیا باتیں ہوں گی۔ میں کیوں کر شروع کروں گا۔ اور کیا کیا کہوں گا خدا جانے وہ کس طرح پیش آئے گی۔ بیگانہ وار یا رسمی طور پر۔ یا لگاوٹ کے ساتھ مگر ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ شیریں کے باپ سہراب جی کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ولایتی شراب کے سوداگر تھے۔ ٹھنڈی سڑک پر ان کی بڑی بھاری دکان تھی۔ وہ خوش حال ضرور تھے۔ پھر بھی کوئی لکھے پڑھے آدمی نہ تھے۔

"خیر مجھے اس سے کیا۔" اس نے سوچا۔ "شیریں اور شیریں کی محبت اگر مجھے مل جائے تو میں سمجھوں کہ میں نے سب کچھ پا لیا۔" دوسرے دن وہ کالج گیا۔ شیریں سے ملاقات ہوئی شیریں نہایت خندہ جبینی کے ساتھ اس سے ملی۔ اور کہا: "میں نے ابا جان کو اس دن

کا سارا واقعہ سنایا۔ انہوں نے آپ کے متعلق کہا کہ یہ لڑکا بڑا جیوٹ معلوم ہوتا ہے اچھا کسی دن اُسے چائے پر بلانا۔ ہم بھی اُسے دیکھیں گے۔ تو پھر اب جس دن آپ کو فرصت ہو ہمارے یہاں تشریف لائیے اور ہمارے ساتھ چائے پیجیے"۔

جاوید کے لئے یہ دعوت بہشت میں جانے کی دعوت سے کم نہ تھی۔ دل تو یہ کہتا تھا کہ فرصت کیسی۔ آج ہی چلو۔ بلکہ ساتھ ہی چلو۔ مگر اُس نے کچھ تامل کیا۔ اور کہا "یوں فرصت تو روز ہی رہتی ہے لیکن اگر آپ کو بھی سہولت ہو تو اگلے اتوار کو حاضر ہوں۔ شیریں نے کہا۔ ہمیں ہر روز سہولت ہے۔ آپ اتوار کو ضرور آئیں۔

بات یہ تھی کہ جب سے مصری جادوگر نے جاوید کا ہاتھ دیکھا تھا اُسے اپنے لباس کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس کا ایک نیا سوٹ سلنے گیا ہوا تھا۔ سنیچر کا وعدہ تھا اُس نے سوچا کہ اتوار کو نیا سوٹ پہن کر جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچا۔ کوٹھی کے دروازہ پر شیریں گلاب کا ایک خوبصورت پھول ہاتھ میں لئے جاوید کی منتظر تھی۔ بڑے تپاک سے اُس نے جاوید کو گڈ ایوننگ کہا اور وہ گلاب کا پھول اس کے کوٹ کے کالر میں لگا دیا۔ انگلستان کے بادشاہ کو "کوہِ نور" ہیرا پا کر شاید اتنی خوشی نہ ہوئی ہوگی جتنی جاوید کو اس گلاب کے پھول سے ہوئی۔ فرطِ مسرت سے اس کی رگوں میں خون کی گردش اور سینے میں قلب کی حرکت تیز ہوگئی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم بالکل ہلکا ہو گیا ہے اور وہ ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔

مسٹر سہراب جی سے جاوید کی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک نہایت شریف طبع انسان تھے۔ بہت بے تکلف اور اخلاص مند۔ جس سے ملتے کھل کر دل سے ملتے۔ جاوید کو انہوں نے بہت پسند کیا۔ اور کہا کہ میاں صاحبزادے! جب کبھی فرصت ہوا کرے ادھر نکل آیا کرو۔ قدرت نے آج جاوید کے لئے اپنی نعمتوں کے خزانے کھول دیئے تھے۔ خوشی کی ناپ تول ممکن نہیں کہ اس کی خوشی کا اندازہ کیا جا سکے بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ فرطِ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اس کی رگ رگ میں نشاط و سرور کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کے چہرے سے۔ اس کی باتوں سے۔ اس کی مسکراہٹوں سے۔ اس کی آواز سے۔ بلکہ ہر انداز سے خوشی اس طرح نمودار ہو رہی تھی جیسے ہلکے ہلکے بادلوں میں سے چاندنی پھوٹ نکلے۔

شیریں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ مسز سہراب جی کا انتقال ہو چکا تھا گھر میں اب صرف تین آدمی تھے۔ ایک مسٹر سہراب جی خود۔ دوسری ان کی بیوہ بہن۔ جو عمر میں ان سے خاصی بڑی تھیں۔ اور تیسری شیریں۔ مسٹر سہراب جی کو اپنے کاروبار سے کم ہی فرصت ملتی تھی۔ شیریں کی پھوپھی بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں پڑی رہتی تھیں۔ اس لئے جب کبھی جاوید شیریں کے یہاں جاتا تو کوئی تیسرا ان کی صحبت میں خلل انداز نہ ہوتا۔

شیریں کا برتاؤ جاوید کے ساتھ نہایت مخلصانہ تھا۔ مگر اس نے کبھی جاوید کو ایک حدِ خاص سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کا ایک سبب غالباً خود

جاوید کی محبوب طبعی بھی تھی۔ بہرحال اچھا وقت گذر رہا تھا۔ اور جاوید مطمئن تھا۔ کہ آج نہیں تو کل "غیریت" کے یہ پردے درمیان سے خود بخود اُٹھ جائیں گے۔ دیکھتے دیکھتے ایک سال نکل گیا۔ اب جاوید اور شیریں دونوں سیکنڈ ایر میں تھے۔ کئی مہینے سے جاوید کی خالہ رضیہ کی شادی کی جلدی کر رہی تھیں۔ اوّل اوّل تو جاوید امتحان کی تیاری کے حیلے کر کے ٹالتا رہا۔ مگر جب امتحان سے فارغ ہو گیا اور کوئی معقول عذر اس کے پاس باقی نہ رہا تو اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ جب تک بی۔ اے نہ کر لوں شادی نہیں کر سکتا کیونکہ شادی کے بعد طالب علمی ناممکن ہے۔ وہ جانتا تھا کہ خالہ اتنی مدت تک جوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھنا کسی طرح پسند نہ کریں گی۔ اور اس نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔ دو ہی مہینے کے اندر اندر رضیہ کی شادی ہو گئی۔ اب وہ ۲۴ سال کی عمر تک پوری آزادی کے ساتھ اُن فردوسی لمحات کا انتظار کر سکتا تھا جن کی خوشخبری مصری جادوگر نے دی تھی۔

وقت گذرتا گیا اور جاوید شیریں کے دل کی گہرائیوں میں اترتا گیا۔ شیریں کی مدافعانہ قوتیں اب روز بروز کمزور پڑتی جا رہی تھیں۔ اور رفتہ رفتہ وہ اپنی خود اعتمادی کھوتی جا رہی تھی۔ جاوید کے لئے اس کی آرزومندی جتنی بڑھتی جاتی تھی اتنی ہی وہ جاوید سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر یہ کوشش برابر ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر آج تک شیریں نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا۔ جسے اعترافِ محبت کہہ سکیں۔ اور جاوید تو محبت کا لفظ بھی زبان پر لانا گناہ سمجھتا تھا۔ ایک

تو خود اس کا طبعی حجاب مانع تھا۔ دوسرے اسے یہ بھی اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کھلم کھلا اظہار محبت سے شیریں برا نہ مان جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امورِ محبت میں اس کا انداز نظر خالص مشرقی تھا۔ اُس کے نزدیک محبوب سے یہ کہنا کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ ایک حد درجہ عامیانہ، سبک اور مبتذل بات تھی اور محبت کے ارفع و بلند جذبے کو وہ اس طرح ذلیل کرنا کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا با ایں ہمہ وہ ایک دوسرے کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔ آنکھوں نے بارہا دلوں کی ترجمانی کی تھی۔

مارچ کا مہینا تھا۔ ۲۱ مارچ کو ایرانیوں کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ یہی آغاز بہار ہے۔ اسی کو نوروز کہتے ہیں۔ یہی پارسیوں کا سب سے بڑا تیوہار ہے۔ حسن اتفاق دیکھو کہ یہی دن شیریں کا یوم ولادت تھا۔ اسی دن اس کی سالگرہ منائی جاتی تھی۔ اس موقع پہ مسٹر سہراب جی کے اکثر اعزہ واحباب نیز مقامی پارسی مرد اور عورتیں سب انکے یہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ رات کا کھانا یہیں کھاتے۔ گاتے بجاتے تاش کھیلتے۔ گپ کرتے باغ کی روشوں پر ٹہلتے۔ غرض ہر طرح اپنا جی بہلاتے اور آدھی رات کے وقت رخصت ہوتے۔

اس مرتبہ جاوید بھی اس پارٹی میں شریک ہوا ہفتہ کا دن تھا۔ اور چاند کی تیس میں تاریخ۔ چاندنی کا بدل تو کوئی چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن رنگ برنگ کے برقی قمقمے درختوں پر اس کثرت سے جگمگا رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا۔ تاروں بھرا آسمان زمین پر اتر آیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بڈھے گپ کرنے اور سگار پینے میں مشغول ہو گئے۔ جوان

اپنے اپنے جوڑے بناکر اِدھر اُدھر روشوں پہ ٹہلنے لگے۔ کوئی کسی بنچ پہ بیٹھا کوئی سبزہ پہ دراز ہو گیا۔ جاوید اور شیریں بھی باغ کے ایک گوشے میں سبزے پہ جا بیٹھے۔ بڑی ہی خوش گوار نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ بھینی بھینی خوشبو سے روح افزا زمیں آتی تھی گلاب کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے جھوم رہے تھے۔ شیریں نے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑ لیا۔ اور کچھ کہے بغیر جاوید کی طرف بڑھا دیا۔ جاوید نے وہ پھول "شکریہ" کہہ کر شیریں کے ہاتھ سے لے لیا۔ پہلے اُسے آنکھوں سے لگایا۔ پھر ہونٹوں سے پھر اپنے رخسار پہ رکھ کر دبایا۔

شیریں نے مسکرا کر کہا "یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

جاوید نے ایک والہانہ انداز سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "پیار۔"

شیریں کچھ شرما سی گئی۔

جاوید نے خلافِ معمول جرأت کر کے کہا "آپ کو پسند ہے؟"

شیریں نے سادگی سے پوچھا "کیا؟"

جاوید نے شوخی سے جواب دیا "پیار۔"

شیریں پھر شرما گئی۔ پھر کئی منٹ تک دونوں خاموش رہے۔ پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ پھر گلاب کے پودے جھومے۔ پھر ایک مست خوشبو نے دونوں پہ بے خودی سی بکھیر دی۔ شیریں وہیں گھاس پہ دراز ہو گئی۔ جاوید بیٹھا ہوا تھا۔ شیریں نے آہستہ سے کہا "آپ بھی لیٹ جائیے نا۔" جاوید بھی وہیں گھاس پہ دراز ہو گیا۔ پھر کئی منٹ

تک دونوں خاموش رہے۔ یکایک جاوید نے ایسا محسوس کیا جیسے شیریں کا ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پہلے تو اس نے خیال کیا کہ شاید بے خیالی میں شیریں کا ہاتھ ادھر آگیا تھا۔ مگر نہیں۔ شیریں کے ہاتھ نے جاوید کے ہاتھ کو چھوا۔ انگلیوں کو مس کیا۔ پہلے آہستہ سے۔ پھر ذرا زور سے دبایا۔ پھر دونوں کی انگلیاں آپس میں بھنچ گئیں۔ ہتھیلیاں مل گئیں۔ جاوید کا بند بند کانپ اٹھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خون کے بجائے پگھلی ہوئی آگ۔ اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے شیریں کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ شیریں نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ جاوید کا جنون تیز ہو رہا تھا۔ اس نے شیریں کی کلائی چوم لی۔ شیریں نے اب بھی اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاوید اور بھی بے اختیار ہو گیا۔

اس نے آہستہ سے کہا "شیریں"

شیریں نے کہا "ہاں"

جاوید نے ذرا بڑھ کر شیریں کے عریاں بازو پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ شیریں کا جسم لرز اٹھا۔ مگر اس نے اب بھی اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور نیچے کا ہونٹ اپنے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

یہ جرعہ جاوید کے لئے بالکل ہی ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ وہ بہکنے لگا۔ اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ اب شیریں کے لبوں پر تھے۔ شیریں کو خدا جانے آج کیا ہو گیا

تھا۔ اس نے اب بھی کوئی مدافعت نہیں کی۔ بلکہ اس کا دوسرا ہاتھ اٹھا اور جاوید کی گردن میں حمائل ہو گیا۔ اس کی گداز بانہوں کی گرمی اور لبوں کی مستی نے جاوید کو بالکل ہی مدہوش کر دیا۔ اور اُس نے دیوانہ وار شیریں کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا تشنہ کام لب شاید ابھی سیراب نہ ہونے پائے تھے کہ دُور سے مسٹر سہراب جی کی آواز سُنائی دی۔ وہ شیریں کو پکار رہے تھے۔ دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ جاوید نے بھی سب کو خدا حافظ کہا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ باپ پر فالج کا دورہ پڑا اور ان کی حالت اندیشہ ناک تھی۔ ماسٹر صاحب پر فالج کا یہ دوسرا حملہ تھا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ ختم ہو گئے۔ سچ ہے بے داغ خوشی کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور جاوید پر تو غم کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا نشاطِ دوشینہ کا کفارہ اسے بہت بھاری ادا کرنا پڑا۔ باپ کے تیجے سے فارغ ہو کر جاوید کالج گیا۔ شیریں کو سب حال بتایا۔ وہ بھی بہت متاثر ہوئی۔ جاوید کی بہت کچھ تسلی تشفی کی اور ڈھارس بندھائی۔

امتحان سر پر آ گیا تھا۔ صرف چند ہفتے باقی تھے۔ جاوید نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور اس روح فرسا غم واندوہ کے باوجود امتحان کی تیاری میں رات دن ایک کر دیا۔ پاس ہوا اور فرسٹ ڈویژن میں۔ شیریں کو سیکنڈ ڈویژن ملا۔ بہر حال دونوں بہت خوش تھے۔ اب دونوں بی۔ اے میں داخلے کے متعلق مشورے

کر رہے تھے۔ ارادہ تھا کہ بی۔ اے میں دونوں ایک ہی مضامین لیں۔ تاکہ ساتھ ساتھ مطالعہ کرسکیں۔ کالج کھلا۔ اور دونوں بی۔ اے کے پہلے سال میں داخل ہو گئے۔

کالج کھلے بمشکل سے دس بارہ دن گذرے ہوں گے کہ ایک دن شیریں بہت ہی ملول و افسردہ کالج آئی۔ اس نے جاوید کو بتایا کہ:۔

"ہمارا کاروبار فیل ہو گیا۔ اس لئے ابا جان نے یہاں کی دوکان بند کر دینے کا تہیہ کر لیا اور اسی ہفتے ہم لوگ بمبئی چلے جائیں گے۔ اب تو زندگی میں شاید ہی کبھی ملنا ہو۔"

جاوید کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ یہ کیا ہو گیا۔ اب تک اس کی امیدوں کی کشتی بڑے امن وسلامتی کے ساتھ ساحل مراد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور ایسی حالت میں کہ منزلِ مقصود بالکل سامنے تھی۔ حوادث کے ایک ہی تھپیڑے نے اسے غرق کر دیا۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ دل پر جبر کیا۔ اور صبر کیا۔ شیریں چلی گئی اور بمبئی ہی کسی کالج میں داخل ہو گئی۔ کئی مہینے تک اس کے خطوط برابر جاوید کے پاس آتے رہے۔ پھر بند ہو گئے۔ جاوید نے پے درپے کئی خط لکھے۔ دو تار بھیجے کسی کا جواب نہ آیا۔ خود بمبئی جانے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر کچھ سوچ سمجھ کر نہ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے یہ دن انتہائی ذہنی اذیت میں گذرے۔

کئی ہفتے کے بعد اچانک شیریں کا خط آیا۔ لکھا تھا "تمہارے کتنے ہی خط آئے تار آئے۔ میں نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ دیا کیا نہیں۔ دے ہی نہ سکی۔ تم خدا جانے اپنے دل میں کیا سمجھتے ہو گے۔ میں تمہیں اپنی مصیبتوں کی داستان کیا سناؤں۔ میں تباہ

ہو گئی۔ ابا جان کا انتقال ہو گیا۔ دنیا میں اب کوئی نہیں جسے اپنا کہہ سکوں۔ پڑھنا چھوٹ گیا۔ دور کے رشتہ کی ایک خالہ مسز مانک جی نوساری میں رہتی ہیں۔ انہوں نے بلایا ہے ناچار وہیں جا رہی ہوں۔ وہاں پہنچکر خط لکھوں گی۔ امید ہے کہ تم مجھ سے ناراض نہ ہو گے۔"

شیریں کا یہ خط پڑھ کر جاوید کو بے انتہا قلق ہوا۔ اس کی تمام امیدیں رفتہ رفتہ خاک میں ملتی جا رہی تھیں۔ اس نے اپنے دل میں کہا "یہ مصری جادوگر یقیناً کوئی جعلیا تھا اس نے مجھے زبردست فریب دیا۔ اور خواہ مخواہ مجھے زندگی بھر کے لئے ایک ناقابل برداشت روحانی عذاب میں مبتلا کر گیا۔ اور میری احمقی دیکھو کہ اس نے جو کچھ کہا میں نے اُسے وحی والہام سمجھا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا حاصل؟" اسے شیریں سے واقعی محبت تھی۔ اور بے انتہا محبت تھی۔ وہ آج بھی اس بات کے لئے تیار تھا کہ بے مایہ و بے نوا شیریں کو اپنا شریک زندگی بنا لے۔ مگر اس کا امکان ہی کہاں تھا۔ وہ فورتھ ایر کا طالبعلم تھا۔ تعلیم ابھی ادھوری تھی۔ قلیل آمدنی۔ اپنی ہی گذر مشکل سے ہوتی تھی۔ نازپروردہ شیریں کا بار کیونکر اٹھاتا۔ اور پھر خود شیریں کیوں اپنی ساری زندگی ایک ایسے بے سروپا انسان کے لئے وقف کر دیتی جو آسانی کے ساتھ خود اپنا کفیل بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ تعلیم سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ صحت بھی خراب رہنے لگی۔

نوساری سے شیریں نے اُسے ایک بھی خط نہ لکھا۔ مگر وہ شیریں کی طرف سے ابھی تک بدگمان نہیں ہوا تھا۔ ایک دن اس نے السٹریٹیڈ ویکلی ——

(ILLUSTRATED WEEKLY) میں پڑھا کہ مسٹر مانک جی کا نوساری میں انتقال ہو گیا۔ مس شیریں سہراب جی کے سوا کوئی ان کا وارث نہ تھا۔ لہٰذا آٹھ لاکھ کی جائداد اور تین لاکھ روپیہ نقد مس شیریں سہراب جی کو ترکے میں ملا۔ مسٹر مانک جی اور مس شیریں کی تصویر بھی اخبار میں چھپی تھی۔ شیریں کی تصویر دیکھ کر جاوید کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے فی الفور اخبار کی وساطت سے شیریں کو تعزیت اور مبارک باد کا خط لکھا۔ پھر ایک بار نئی نئی امیدیں اس کے سینے میں مچلنے لگیں۔

خلاف توقع شیریں کا جواب بہت جلد آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ آج کل میں بمبئی میں ہوں اور اب یہیں رہوں گی۔ کیونکہ جائداد کا سارا انتظام خود کرنا ہے۔ اور جائداد کل کی کل یہیں بمبئی میں ہے۔ اتنے دنوں تک خط نہ بھیجنے کی معذرت بھی کی تھی۔ اور مبارکباد کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ اور لکھا تھا۔ کہ حسب معمول خط لکھتے رہنا۔ اور امتحان کی تیاری اچھی طرح کرنا۔

جاوید کا دل پھر ایک بار خوشی سے لبریز ہو گیا۔ اور مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔

"واقعی خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ مصری جادوگر نے سچ کہا تھا۔ کہ ہاتھ کی لکیریں جھوٹ نہیں بولتیں۔ قسمت کے ستارے غلط نہیں کہتے۔ خدا میرے گناہوں کو معاف کرے۔ میں ناحق اس بیچارے سے بدگمان ہوا اور اتنا کچھ برا بھلا اسے کہہ ڈالا۔" پھر ایک بار نئی امنگیں اس کا دل بڑھانے لگیں۔ پھر ایک بار نہایت سرگرمی

کے ساتھ اس نے مطالعہ شروع کر دیا۔

شیریں کے خطاب دیر دیر میں آتے تھے اور ان میں سے وہ پہلی سی خلوص کی کیفیت بھی رفتہ رفتہ مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ جاوید پھر اداس رہنے لگا تھا۔ اس کا دل اب ذرا سی ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔ صحت برابر گرتی جا رہی تھی۔ مطالعہ دشوار ہو گیا تھا پھر بھی وہ اپنی سی کئے جاتا تھا۔ ایک دن رؤف نے اس سے کہا: "بھیا! جان ہے تو جہان ہے۔ زندگی ہے تو تعلیم بھی ہو جائے گی صحت کا خیال ہر چیز پر مقدم ہے۔ میری صلاح مانو تو لکھنؤ چلو وہاں اچھے اچھے طبیب ہیں۔ پہلے جم کر اپنا علاج کرو۔ اور جب پورے طور پر تندرست ہو جاؤ تو کتابوں کو ہاتھ لگاؤ۔

رؤف بہت مخلص دوست تھا۔ اس کے اصرار سے جاوید لکھنؤ جانے پر آمادہ ہو گیا اور دوسرے ہی دن وہ دونوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ جاوید کی طبیعت اس دن معمول سے کچھ زیادہ مضمحل تھی۔ دل بہت ہی گھبرا رہا تھا۔ سفر بہر حال اچھا گذر رہا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اور مسافروں کی کشمکش بھی نہ تھی۔ کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور ایک اینگلو انڈین اس ڈبے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں انگریزی کے کچھ اخبار، کچھ رسالے اور بغل میں دو ایک کتابیں تھیں۔ رؤف اور جاوید آمنے سامنے کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ اینگلو انڈین رؤف کے برابر بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔

رؤف نے السٹریٹڈ ویکلی اس سے لے کر ورق گردانی شروع کی۔ تصویروں کا صفحہ نکالا۔ کئی نئے شادی شدہ لوگوں کی تصویریں اس میں تھیں۔ وہ دیکھتا رہا

نیچے کی طرف جیسے ہی ایک تصویر پر اس کی نظر پڑی وہ اچھل پڑا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا

"مسٹر فیروز مودی اور مس شیریں سہراب جی جن
کی اسی ہفتے بمبئی میں شادی ہوئی ہے۔"

روٗف نے گھبرا کر جاوید سے کہا۔

"دیکھنا! یہ وہی شیریں تو نہیں۔"

جاوید نے اخبار روٗف کے ہاتھ سے لے لیا۔ تصویر پر ایک نظر ڈالی اور نہایت اطمینان کے ساتھ کہا۔

"ہاں وہی ہے۔" اخبار روٗف کو واپس دیدیا۔ اور خود کھڑکی کے باہر خلا میں دیکھنے لگا۔

اس خبر سے اس کے دل پر کیا گذری۔ یہ تو اس کا دل ہی جانتا ہوگا۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اس واقعہ سے کوئی اثر ہی نہیں لیا ——— مگر تھوڑی دیر بعد روٗف نے اس کی نبض پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جسم بھٹی کی طرح دہک رہا ہے ——— ریل تیزی کے ساتھ اڑی چلی جارہی تھی ———

سچّی کہانی

ناہید کے خطوط

ایک تصویر کسی شوخ کی اور چند خطوط
یہی سرمایۂ دُنیا، یہی سرمایۂ دیں

سچی کہانیاں میں نے بہت لکھیں مگر لکھتے وقت دل اتنا متاثر شاید کبھی نہیں ہُوا جتنا آج ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ سانحہ دوسرے واقعات سے کچھ زیادہ اندوہناک ہے۔ دُنیا میں ایسی اور اس سے کہیں زیادہ دل ہلا دینے والی کہانیاں ہر روز مکمل ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اُس تعلق خاطر کی بنا پر جو مجھے اس کہانی کے مرکزی کردار سے تھا، جس کی مایوس آنکھیں عالمِ خیال میں اس وقت بھی اپنی نامرادی کی داستان مجھے سُنا رہی ہیں لکھتے وقت میرا دل غم کے بوجھ سے کچلا جارہا ہے۔

پروفیسر ب۔ س مرحوم۔ ان قابلِ قدر ہستیوں میں تھے جن کی دوستی پر میرا دل

ہمیشہ فخر کرے گا۔ حقیقی بھائیوں کی طرح ہمدرد، بے ریا دوستوں کی طرح وقت پر کام آنے والے۔ بااخلاص مریدوں کی طرح جاں سپار۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ مگر ان کی سب چیزیں ایک فرضی نام سے شائع ہوتی تھیں۔ ادبی دنیا میں انہوں نے اپنے لئے ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ ہمارے دلوں کے درمیان اگرچہ اتنا قرب تھا۔ مگر معاش کی مجبوریوں نے ہمیں ایک دوسرے سے ہزاروں کوس دور پھینک دیا تھا۔ برسوں ملاقات کی نوبت نہیں آتی تھی۔ خط وکتابت کا سلسلہ بہرحال جاری تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ دل کی بہت سی باتیں خطوں میں نہیں لکھی جاسکتیں۔

دسمبر ۱۹۳۵ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے مجھے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں شریک ہونے کیلئے میسور جانا پڑا۔ واپسی میں دو دن کے لئے میں س بس کے پاس ٹھہرا۔ میں نے انہیں بے حد افسردہ و مایوس بلکہ زندگی سے بیزار پایا انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت قلق ہوا۔ وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے اصرار کیا تو اُن کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ پھر بولے۔

"بھیّا! تم سے کیا پردہ۔ اور دنیا میں تمہارے سوا پوچھنے والا اور سننے والا ہے بھی کون۔ مگر ایک بے کیف داستان تمہیں کیا سناؤں۔ اور سچ پوچھو تو وہ داستان ہے بھی کب۔ ایک سیدھا سادہ مختصر سا واقعہ۔ مگر وہی زندگی کی ابتدا تھی اور اسی پر زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ یوں کہنے کو اب بھی زندہ ہوں۔ مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ بے کیف زندگی ایک مستقل عذاب سے کم نہیں۔"

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے خیالات میں کھو گئے ہیں میں نے کہا کچھ بھی سہی۔ مگر مجھے اس کی تفصیل تو سناؤ۔ انہوں نے کہا۔

"جنوری ۱۹۳۶ء میں رسالہ ..... (دہلی) کی معرفت لکھنؤ سے ایک خط آیا۔ لکھنے والے نے خود کو چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔ نام کی جگہ صرف دو حرف لکھے تھے۔ ز۔ ح۔ اور عبارت سے کسی طرح اس بات کا پتا نہیں چلتا تھا۔ کہ کسی مرد نے لکھا ہے یا عورت نے۔ مگر خط نسوانی تھا۔ جب سے میں نے افسانہ نگاری شروع کی، لڑکیوں اور عورتوں کے خط آیا ہی کرتے تھے۔ مگر اس ٹریجڈی کے بعد جس کا حال آپ کے سوا کوئی نہیں جانتا میرے دل میں رومانس کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا نہ میں اِن خطوں سے کوئی دلچسپی لیتا تھا نہ ان کے جواب ہی دیتا تھا؛

لکھنؤ کے اس خط میں یہ مصرع درج تھا :۔

راز کیا فاش کرو دل آپ کی رعنائی کا

اور بڑی منت کے ساتھ مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ اس پر غزل لکھ کر بھیج دیجئے۔ اتفاق سے اُس دن طبیعت حاضر تھی۔ میں نے سات شعر کی ایک غزل لکھ کر بھیج دی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر پردہ ایسا ہی ضروری تھا تو ایک نامحرم کو خط ہی کیوں لکھا۔ اس کا جواب بہت دلچسپ آیا۔ اور میں نے فوراً ہی دوسرا خط لکھ دیا۔ اِس طرح خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ کئی مہینے تک۔ شاید چھ مہینے تک میں نے اپنا اصلی نام اور پتا نہیں بتایا۔ رسالہ ... کی معرفت خط آتے رہے۔ مگر آخر یہ حجاب بھی اُٹھ گیا۔ اُس نے بھی

اپنا نام لکھا۔ پھر رفتہ رفتہ حالات بھی لکھے۔"

"وہ ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ ناہید جمال اُس کا نام تھا۔ پہلے مسلم گرلس اسکول میں اور بعد میں ازابیلا تھوبرن (آئی۔ ٹی۔ کالج) لکھنؤ میں پڑھتی تھی۔ خطوں میں ہمارے درمیان مختلف مسائل پر تبادلِ خیالات ہوا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایک ایف۔ اے کی طالبِ علم اور اتنے بلند خیالات اور اتنا پیارا اندازِ تحریر۔ تعلقات بڑھتے گئے۔ اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ گرمیوں کی تعطیل میں، میں لکھنؤ گیا۔ تم اس وقت ولایت میں تھے۔ اتفاق سے انہیں دنوں وہ ایک شادی میں دہلی چلی گئی۔ اور وہاں جا کر بیمار ہو گئی۔ میں بھی دہلی پہونچا کھوج لگایا۔ معلوم ہوا کہ وہ لکھنؤ واپس چلی گئی۔ میں پھر لکھنؤ آیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں تعطیل تھی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس کے متعلق کوئی صحیح اطلاع حاصل نہ کر سکا۔ ناچار بے نیلِ مرام واپس چلا آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دہلی میں اس کے لکھنؤ واپس آنے کے متعلق جو اطلاع ملی تھی وہ غلط تھی۔ قصور اُس کا نہ تھا مگر ناکامی سے جھنجلا کر میں اُس سے خفا ہو گیا۔ اور کتنے دنوں تک خط نہ لکھا۔ اُس نے جلد ہی مجھے منا لیا۔ اور خط و کتابت کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔

رفتہ رفتہ تعلقات دوستی کی حد سے گذر گئے۔ جذبات مچلنے لگے۔ بیتابیاں بڑھنے لگیں۔ میں نے اُسے ایک ہدیہ بھیجا۔ طلائی آویزے۔ اس نے کچھ اس طرح شکریہ ادا کیا کہ میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ بڑی تاکید سے لکھا تھا کہ آئندہ کبھی میرے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرنا۔ نہیں تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔ یہ سب کچھ تھا۔ پھر بھی وہ میرے ساتھ

پورے طور پر کھلتی نہ تھی۔ میں پھر بگڑ گیا۔ اس نے حد سے زیادہ معذرت کی۔ بار بار معافی چاہی اور کھلے لفظوں میں محبت کا اعتراف کیا۔ میں بے اختیار ہو گیا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں پھر ایک بار لکھنؤ گیا۔ اُسے خط بھی لکھ دیا تھا۔ اور لکھنؤ ہی میں اس کا جواب مانگا تھا۔ مگر مجھے بے انتہا مایوسی ہوئی جب لکھنؤ پہونچ کر مجھے اس کا کوئی خط نہ ملا۔ لکھنؤ سے میں نے اُسے ایک اور خط لکھا اور اپنے لکھنؤ پہونچ جانے کی اطلاع دی۔ کئی دن تک انتظار کیا۔ مگر اس کا کوئی خط نہ آیا۔ آخر بہت رنجیدہ ہو کر ایک خط اور لکھا۔ بہت ہی غصہ میں بھرا ہوا۔ اور اسی دن لکھنؤ سے واپس چلا آیا۔

وہ بیمار تھی۔ علاج کی غرض سے دہلی گئی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے میرا پہلا خط اُسے ملا ہی نہیں۔ ڈاک والوں نے کہیں گم کر دیا۔ بعد کے دونوں خط اس وقت ملے جب وہ دہلی سے واپس آئی۔ دہلی کے علاج سے اُسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لکھنؤ آ کر اُس نے مجھے یہ سب تفصیل لکھی۔ میرا دل بہت رنجیدہ تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس کا ایک خط اور آیا۔ میں نے اب بھی جواب نہ دیا۔ نومبر میں اس کا ایک خط اور آیا۔ جسے پڑھ کر میں تڑپ اُٹھا۔ وہ بہت بیمار تھی۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ اس نے میری تصویر مانگی تھی۔ وہ بھی بھیج دی۔ مگر نہ تصویر کی رسید آئی نہ خط کا جواب ملا۔ میں سخت پریشان تھا۔ میں نے دوسرا خط لکھا۔ پھر تار دیا۔ پھر تابڑ توڑ کئی خط لکھے۔ مگر جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ میں نے بھی اس سے تصویر مانگی تھی۔ اس نے بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ وہ بھی نہ آئی۔ مراسلت یک قلم موقوف ہو گئی۔

جنوری سے لیکر نومبر تک گیارہ مہینے میں اس کے کُل سترہ خط آئے۔ میرا دل بے حد رنجیدہ تھا۔ اور روز بروز مجھے اس امر کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ کہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اُس نے میرے ساتھ ایک کھیل کھیلا تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس خیال سے میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے کتنا دکھ ہوا۔ مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ مراسلت موقوف ہونے کے تقریباً ڈھائی برس بعد یعنی گزشتہ جولائی میں یکایک اور خلافِ توقع پھر رسالہ . . . (دہلی) کی معرفت اس کی تصویر آئی۔ ایسی تصویر جسے انگریزی میں (SILHOUETTE) (نیم رخ بہ شکل سایہ) کہتے ہیں۔ تصویر تو کیا اُسے ایک تاریک ساخاکہ کہنا چاہیئے۔ میں بھرا ہوا تو پہلے ہی بیٹھا تھا۔ یہ تصویر دیکھ کر اور بھی چڑھ گیا۔ سمجھا کہ میرے جذبات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ مجھے بنا رہی ہے۔ تصویر کی پُشت پر لکھا تھا۔

"معاف کر دو۔

بد نصیب ناہید"

میں نے تصویر کے جواب میں یہ دو شعر لکھ کر بھیج دیئے:۔

بُرو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

کیوں یہ پھر ہونے لگیں لطف و کرم کی باتیں!
کیا تمہیں اور کوئی تازہ ستم یاد آیا!

چند روز بعد اس کا جواب آیا۔ وہ بیمار تھی۔ بہت بیمار۔ زندگی سے بالکل مایوس اپنی خطاؤں کی ..... معافی چاہی تھی۔ ہائے افسوس ہیں نے اُس خط کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بُری طرح اس سے بدگمان ہو چکا تھا میرا خیال تھا کہ یہ سب فریب ہے کچھ دنوں کے بعد اُس کی سہیلی رضیہ کا خط آیا۔ لکھا تھا:۔

" مبارک ہو ناہید مرگئی۔ خدا کی قسم یہ خونِ ناحق آپ کی گردن پر ہے۔"

میں نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ مگر پچھلے دنوں آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ کی ایک پروفیسر مس ..... کسی ضرورت سے یہاں آئی تھیں۔ ..... صاحب کے یہاں اتفاقاً ان سے میرا تعارف ہوا۔ دوسری یا شاید تیسری ملاقات میں ان کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ناہید نام کی کوئی لڑکی تین سال قبل ایف۔ اے کلاس میں آپ کے یہاں پڑھتی تھی؟"

وہ حیران ہو کر بولیں "ہاں وہ میری شاگرد تھی۔ مگر آپ اُسے کیونکر جانتے ہیں؟ ہائے وہ تو ایسی جواں مرگ ہوئی کہ سارے کالج کو اس کی موت کا صدمہ ہے۔ خدا نے جیسی اچھی صورت اُسے دی تھی۔ ویسی ہی اچھی اُس کی سیرت بھی تھی۔"

مس ..... کی باتیں سُن کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ تین برس قبل کے سارے واقعات آنکھوں میں گھوم گئے۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا جس چیز کو میں نے آج تک فریب سمجھا تھا۔ دراصل وہ ایک ناقابلِ انکار اور جاں گسل

حقیقت تھی۔ آہ! بھائی کیا بتاؤں کہ دل کی کیا حالت ہوئی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خوشی کا احساس ہی میرے دل سے مٹ گیا۔ زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ یہ جینا نہیں۔ زندگی کی سانسیں پوری کرنا ہے۔ اس ساعت کا منتظر ہوں جب اس رُوحانی عذاب سے نجات مل جائے گی"۔

یہ کہہ کر وہ پھر آبدیدہ ہو گئے جس طرح ممکن ہوا میں نے اُنہیں تسلّی دی اور کہا کہ اس کی تصویر اور خطوط تو مجھے دکھاؤ۔ انہوں نے وہ تصویر اور خطوط لاکر میرے سامنے رکھ دیئے۔ تعداد میں یہ خطوط کل اٹھارہ تھے۔ ہم دونوں نے مل کر اُن سب کو پڑھا۔ آخری خط پڑھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ اور میں انتہائی کوشش کے باوجود اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ اور س۔ س کی تو یہ حالت تھی جیسے ابھی ابھی کسی عزیز کا انتقال ہوا ہے۔ رو دھو کر غم کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو میں نے کہا۔

"یہ خطوط ادبی حیثیت سے بھی ایک قابلِ قدر چیز ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو مرتب کر کے ایک تمہید کے ساتھ انہیں شائع کرا دوں"۔ انہوں نے کہا "ابھی نہیں مجھے زندگی کی سرحدوں سے گزر جانے دو۔ اس کے بعد مناسب سمجھو تو چھپوا دینا"۔

میں ڈھاکہ واپس چلا آیا۔ س۔ س کے خطوط حسبِ معمول آتے رہے۔ چند مہینے کے بعد وہ بیمار ہوئے۔ صحت برابر گرتی ہی چلی گئی۔ اُسی میں نمونیا ہو گیا۔ اور وہ اپنے چاہنے والوں کو روتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے نقابِ خاک میں رُوپوش ہو گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مرنے سے کچھ پہلے ہی اُنہیں اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ زندگی کی آخری ساعتیں آپہونچیں اُسی دن اُنہوں نے ناہید کی تصویر اور خطوط کا پارسل میرے نام بھجوا دیا جو مجھے اُن کی وفات کے کئی دن بعد ملا۔ پارسل کے اندر جس لفافے میں تصویر اور خطوط بند تھے۔ اس پر یہ شعر لکھا تھا۔

ایک تصویر کسی شوخ کی اور چند خطوط

یہی سرمایۂ دنیا یہی سرمایہ دیں

آج جب کہ وہ دونوں اِس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں اور میرے سوا اس راز کا جاننے والا کوئی نہیں ہیں ناہید کے خطوط شائع کر رہا ہوں۔ ان کی اشاعت سے میرا مقصد نہ تو ایک اندوہناک افسانہ سنانا ہے۔ اور نہ ادبی حیثیت سے ان کی اہمیت پیش نظر ہے۔ بلکہ ان کے مطالعہ سے چند ایسے مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن کا تعلق ہماری سوسائٹی کے پورے نظام سے ہے۔ اور جن کے متعلق غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا اور کوئی مناسب طریق کار اختیار کرنا سماجی بہبود کے لئے ازلس ضروری ہے۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں والدین کی مداخلت کس حد تک جائز ہے اور کس حد تک ناجائز۔؟

اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ والدین جو کچھ کرتے ہیں اولاد کی بہبود کے خیال سے کرتے ہیں۔ والدین کا یہ فرض کر لینا کس حد تک درست ہے کہ

فقط دولت ہی لڑکی کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے کافی ہے ؟

بزرگوں کا یہ نظریہ کس حد تک قابلِ قبول ہے ۔ کہ نوجوان کی پسند محض جذبات پر مبنی ہوتی ہے ۔ اور اُن کا یہ خیال کہاں تک ٹھیک ہے ۔ کہ ایسی شادیاں جو لڑکیوں کی مرضی کے خلاف کی گئی ہوں ۔ انجام کار عموماً کامیاب ثابت ہوتی ہیں ۔ کیونکہ جذبات کا جوش پائیدار نہیں ہوتا ۔

کیا جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے بزرگوں اور والدین کی مرضی کے خلاف محض اپنی پسند اور میلانِ خاطر کی بنا پر شادی کر لینا چاہیئے ۔ ؟"

کیا ہمارے ادبی رسالوں میں چھپنے والے مضامین، افسانے اور نظمیں نوجوان لڑکوں کو اور نوجوان لڑکیوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں مدد دیتے ہیں ؟

کیا ان رسائل کی مدد سے پردہ نشین لڑکیوں کو بیگانہ مردوں سے رسم و راہ قائم کرنے کا موقع ملتا ہے ؟ کیا یہ کوئی بُری بات ہے ؟ اگر بُری بات ہے تو کیا اس کی روک تھام کا کوئی بندوبست ممکن ہے ؟

کیا موجودہ صورتِ حالات ہمارے اخلاقی نظام کے لئے کسی خطرے کا پیش خیمہ ہے ؟ اور اصلاحِ حال کے لئے کیا نوجوانوں پر کچھ پابندیاں عاید کرنے کی ضرورت ہے ؟ اور پابندیوں کا عائد کرنا کیا ممکن بھی ہے ؟

یہ اور اسی قسم کے کتنے ہی اور سوالات ان خطوط کے مطالعے کے بعد آپ کے ذہن میں آئیں گے ؟ کیا ٹھنڈے دل سے اِن امور پر غور کر کے ۔ ایک مناسب

اور صحیح راہِ عمل معین کرنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں؟

ناہید کے خطوط

پہلا خط

لکھنؤ

۲۲؍جنوری ۱۹۳۲ء

مکرمی جناب بھائی موہن صاحب، تسلیم

شاید آپ "موہن" ہونے کے ساتھ ساتھ "مشکل کشا" بھی ہیں، کیونکہ میرا دل کہتا ہے۔ بھائی موہن! کیا آپ حسب ذیل "طرح" پر چند اشعار کہہ کر مجھ کو بھیج سکتے ہیں؟

ع راز کیا فاش کروں آپ کی رعنائی کا

مجھے تسلیم ہے کہ آپ کا قیمتی وقت ضرور خراب ہوگا، مگر شاید یہ تھوڑی سی تکلیف گوارا کر لینے سے یہاں کسی غریب کی ایک مشکل حل ہو جائے گی۔ کیا آپ میرے لئے اس تکلیف کو گوارا کر سکتے ہیں؟ اگر ہاں تو۔۔۔۔ تب!!! فقط

ایک امیدوارِ عنایت

؟

پتہ یہ ہوگا:۔ ز۔خ۔ ۔ ۔ ۔ نمبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امین آباد پارک ۔ ۔ ۔ لکھنؤ۔

نوٹ:۔ آپ کا ذاتی پتہ معلوم نہیں۔ اس لئے یہ خط آپ کو رسالہ ۔ ۔ ۔ کی معرفت ملے گا۔

خط نمبر ۲

لکھنؤ

۱۲ر فروری ۱۹۳۲ء

محب عزیز! تسلیم

عنایت نامہ آپ کا ملا، بہت بہت شکریہ۔ آپ کی چند سطریں مختصر ضرور ہیں مگر ناقابلِ فہم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے کوشش ضرور کی تھی۔ کہ میرے اور آپ کے درمیان پردہ پڑا رہے تو اچھا ہے۔ مگر آپ پردا نہیں چاہتے۔ مہربان یہ کچھ آپ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ شخص جس کو اصطلاحِ عام میں "مرد" کہتے ہیں۔ عورت کو ہر عورت کو بے نقاب دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ ۔ ۔ ۔ شاید وہ "اپنی فطرت" سے مجبور ہے مگر گستاخی معاف۔ مجھ کو تو یہ بات کچھ بے ربط سی معلوم ہوتی ہے۔

خیر جانے دیجئے۔ عورت و مرد کا فلسفہ بہت پرانا اور بے ڈھب ہے! اچھا تو یہی ہوگا اس پر بھی "پردا" ڈالیے۔

آپ کی تحریر پڑھ کر مجھ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔ اچھا فرض کیجئے کہ میں ایک عورت

ہوں۔ تو بھی آپ مجھ پر یہ قید تو نہیں لگا سکتے کہ میں آپ جیسے "نامحرم" (آپ کی اصطلاح میں) کو خط نہ لکھوں۔ آج اگر آپ نسوانی حقوق چھین کر اپنے آپ کو "نامحرم" اور ناقابلِ اعتماد لکھتے ہیں۔ تو کیا میں بھی آنکھیں بند کر کے آپ کو خط لکھنا چھوڑ دوں؟ یہ تو سراز زبردستی ہے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ عورت التفات رکھتے ہوئے بھی گمنام رہنا چاہتی ہو۔ مگر حیف کہ آپ جیسے شعریت و رومانیت کو فنا کرنے والے ہمیشہ اُسکو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ پردے کا لطف آپ کیا جانیں۔ عورت ہمیشہ "راز" اور رازداری پسند کرتی ہے مگر آپ تو مرد ہیں!!

آپ کے اشعار جو واقعی میری مشکل کا حل ثابت ہوئے، خوب ہیں۔ افسوس کہ آپ نے ان کو اپنی جانب منسوب کرنا پسند نہ کیا[1]۔ ورنہ میرا دوسرا مطلب بھی ———— پورا ہو جاتا۔ آخری شعر بقول آپ کے لطیف ترین شعر ہے۔ باقی بھی بُرے نہیں۔ مثلاً:۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ

آپ کے اشعار کی مکمل تشریح سے تو میں قاصر ہوں۔ مگر ہاں شاید میں پھر کبھی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ فی الحال تو یہ محض آپ کے خط کی "رسید" ہے۔ آپ کی علالت کا پڑھ کر افسوس ہوا اور زیادہ یوں بھی کہ ایسے وقت میں مَیں نے آپ کو ایک تکلیف دی۔

---

[1] س۔س نے لکھا تھا: "اِن اشعار کو میری جانب منسوب نہ کیجئے گا۔"

مندرجہ بالا تحریر سے اگر آپ کچھ سمجھ سکیں تو فبہا۔ اور ع

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے[1]

فقط

خیریت طلب

نوٹ :۔ (معافی! اگر کوئی گستاخی ہوئی ہو اس خط میں)

خط نمبر ۳

لکھنؤ

۱۰ مارچ ۱۹۳۲ء

بندہ پرور، تسلیم

آپ کا دلچسپ خط ملا۔ مزید یادآوری کا شکریہ۔ مہربان آپ خفا نہ ہو جیے۔ آپ تو جوشِ تحریر میں نہ جانے کیا کیا لکھ گئے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عام اصول کے

---

[1] س۔ س نے جواب میں تین مصرعے لگا کر قطعہ مکمل کیا۔ اور خط کے آخر میں اُسے درج کر دیا۔ وہ قطعہ یہ ہے:۔

آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے دری کہہ رہے ہیں وہ — "پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے"

بس جی یہ چاہتا ہے کہ کہدوں جواب میں — ان دستہائے ناز کے قربان جائیے

تحت آپ کو بھی ایک ہوسناک مرد سمجھا اور کچھ نہیں۔ افسوس آپ نے میری تحریر سے ایک غلط مطلب اخذ کیا ہے۔ مجھ کو کیا حق؟ میں نے تو ایک عام اور سچی بات کہہ دی تھی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ میرا مطلب کم از کم "ہوس" سے تو نہ تھا۔

افسوس آپ نے میری خط و کتابت کی جو وجہ بیان کی ہے۔ وہ سراسر غلط ہے آپ کے نزدیک میری خط و کتابت کا واحد مقصد محض آپ کی خامیوں پر نکتہ چینی کرنا ہے حالانکہ میرا یہ وہم و گمان بھی نہ تھا۔

آپ کے اشعار کی تعریف واقعی کمزور لفظوں میں کی گئی ہوگی۔ اس کو میری تحریر کی خامی سمجھئے۔ ورنہ دراصل وہ ایک اعلیٰ تعریف کے مستحق ہیں۔ آپ اور میں شاعری کی کجی کے متعلق تو متفق الرّائے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ شاعری ہی کیا جس میں حقیقت نہ ہو اس بارے میں آپ کا ایک شعر

.... ش ....

مہربان اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بات پوچھوں! آخر وہ کونسی افتاد پڑی تھی کہ جس سے آپ دنیا سے بیزار ہو بیٹھے ہیں۔ اگر لکھنؤ میں آپ کے "درد" کا علاج ہو سکتا ہو تو مجھ کو ضرور لکھیئے گا۔ اور کیا ہم ایک مرتبہ آپ سے آپ کی "آپ بیتی" (جگ بیتی نہیں چاہیئے) سُن سکتے ہیں اگر کچھ حرج نہ ہو تب ....

فقط

خط نمبر ۱۴

لکھنؤ

۱۴ مئی ۱۹۳۲ء

موہن صاحب! تسلیم

یقیناً آپ کو میرے جواب نہ دینے پر ایک شکایت ہوگی لیکن کیا کروں مجبور رہوں۔ جب صیاد ایک چڑیا کو پکڑ کر قفس میں قید کر دیتا ہے تو بے چاری چڑیا کو اپنے آپ پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ اس کی زندگی، زندگی کی تمام مسرتیں قفس کی چہار دیواری ہی تک محدود ہو جاتی ہیں۔ اس کو بجز موت کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی۔

سوچیئے تو موہن صاحب آپ تو ماشاءاللہ تعلیم یافتہ اور کم از کم نصف دنیا کی سیاحت کیئے ہوئے "تجربہ کار" شخص ہیں۔

عورتوں کے متعلق آپ کے خیالات آپ کے بھیجے ہوئے افسانے "......" میں پڑھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ کے خیالات ایک حد تک صحیح ہیں تو بے جا نہ ہوگا وفاداری اور بے وفائی کو صرف ایک فرقے تک محدود کر دینا سراسر ظلم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بے وفائی اور وفاداری اپنے اپنے ذاتی افعال ہیں کسی خاص فرقے سے ان کو نہ کوئی خاص رشتہ یا تعلق ہے اور نہ ہوگا۔ اگر مرد بے وفا ہوتا ہے تو وہ وفا بھی کر سکتا ہے۔ یا اگر ایک عورت وفادار ہے تو وہ بے وفائی بھی کر سکتی ہے۔ غرض یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ فلاں فرقہ ہمیشہ بے وفا ثابت ہوا ہے۔ مگر ہاں بعض باتیں مرد میں اس قسم کی پائی جاتی ہیں جن سے وہ بے وفائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یا ہم اس کو بے وفا کہہ دیتے ہیں، "ہوسناکی" شاید مرد کی خاص فطرت ہے۔ مثلاً ایک شخص کی بیوی نہایت حسین قبول صورت، نیک تعلیم یافتہ ہے۔ مگر شوہر کو اس کی پرواہ بھی نہیں اور اس کا تعلق کسی دوسرے سے ہے۔ بیوی کو سب کچھ معلوم ہے۔ مگر وہ کہہ کچھ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ ایک عورت ہے اور پھر وہ خود عورت نہیں بلکہ "سوسائٹی" نے اس کو تمام حقوق سے "بے نیاز" کر کے محض ایک عورت بنا دیا ہے۔ برخلاف اس کے اگر عورت کا کسی سے تعلق ہو جائے اور شوہر صاحب کو اس کا پتہ چل جائے تو سمجھ لیجئے کہ ۵۷ء کا غدر اور اللہ میاں کی قیامت ایک ساتھ اس بے چاری پر نازل ہو جائیں۔ یہ سب کیوں؟ محض اس لئے کہ شوہر صاحب مرد ہیں۔ شاید جنگل کا شیر اپنے شکار میں کسی دوسرے کو اپنا حصہ دار بنتا نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے وہ خود شکار سے لطف اندوز ہو یا نہ ہو۔ مگر شکار تو بہرحال اس کا ہے۔ دوسرے کو کیوں حصہ دار بنایا جائے؟ اب آپ چاہے اس کو مرد کی بے وفائی کہہ لیجئے یا ظلم! "مرد مرد ہے اور عورت عورت" یہ مقولہ تو بارہا سنا ہوگا آپ نے موہن صاحب!

اپنے گذشتہ خط میں آپ نے میری فرمائش پر اپنی آپ بیتی اشعار کی صورت میں بھیجی تھی۔ مگر افسوس کہ میں اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ رہا "میں" اور "ہم"[1] کا

---

[1] خط نمبر ۲ میں ناہید نے لکھا تھا: کیا ہم آپ سے آپ کی آپ بیتی سُن سکتے ہیں"۔ ایس۔ ہی نے اسکے جواب میں لکھا تھا: ہم سے مقصود صرف آپ کی ذات ہے یا اس میں اور لوگ بھی شامل ہیں؟"

معاملہ تو موہن صاحب کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے ؟ حالانکہ میری زندگی میں بجز میرے اور کسی کا وجود تک نہیں ہے۔ یوں آپ کو اختیار ہے جو چاہے سمجھئے۔

موہن صاحب! میرے چند سوالوں کا جواب ضرور دیجئے گا۔ یہ میری التجا ہے۔

(۱) محبت کیا ہے

(۲) محبت کیوں ہوتی ہے۔

(۳) محبت کی ابتدا و انتہا کیا ہے۔

(۴) سچی اور جھوٹی محبت کی صحیح تعریف کیا ہے ؟

آپ کے بھیجے ہوئے افسانہ . . . کا بہت بہت شکریہ۔ فقط۔

خط نمبر ۵

جمال پیلس۔ نیو دہلی

۲۹ مئی سنہ ۱۹۳۲ء

بندہ نواز تسلیم

خوش قسمتی سے مجھے آپ کا خط لکھنؤ ہی میں مل گیا تھا۔ میں اپنی ایک عزیز سہیلی کے بھائی (جن کی معرفت آپ کا خط آتا ہے) کی شادی میں شرکت کرنے دہلی آئی ہوئی ہوں۔ مہربان آپ خواہ س۔ش ہوں یا آسمانی فرشتے۔ میں نے تو آپ کو "موہن" یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک مخلص دوست سمجھ لیا ہے اور بس!

رسالہ " . . . . " میں ایک مرتبہ آپ کا ایک مضمون جو آپ نے س۔ش کے روپ

میں لکھا تھا اور جس میں آپ نے موجودہ شاعری پر ایک ہلکا سا تبصرہ کیا تھا یا بالفاظ دیگر موجودہ شاعری کا خاکہ اڑایا تھا میں نے پڑھ کر آپ کی شخصیت پر شبہ کیا تھا اور خاص طور سے یوں کہ ایک جگہ آپ نے مثال کے طور پر اپنا ہی یہ شعر پیش کیا تھا۔

.... ٭ ....

مومن صاحب میں نہیں جانتی کہ آپ کے خط کا کیا اور کیسے جواب دوں؟ "عورت" اس کے تو نام ہی سے اس کی فطری کمزوری کا پتا چلتا ہے لیکن آفرین ہے "ابن آدم" پر کہ ایک کمزور چیز کو حاصل کرنے کے لئے "خودداری" جیسی جنس گرانمایہ کو اسکی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ معاذ اللہ! مومن صاحب آپ نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ ایک سچی حقیقت ہے۔ بلکہ خدا کی قسم اس سے بھی کچھ سوا۔

آپ کا خط جن لطافتوں سے لبریز ہے اور جو دلپذیر نکتے آپ کے قلم نے انتہائی سادگی سے بیان کر دیئے ہیں وہ شاید کمزور اور ناتواں دل ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کاش میں آپ کو اپنی سرگزشت سنا سکتی! بس اتنا سمجھ لیجئے۔ کہ دنیا کی تمام آسائشیں اور آرام مجھ کو میسر ہیں لیکن حیف کہ ان سے لطف اندوز ہونا میری قسمت میں نہیں کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ مومن صاحب آپ کو سب کچھ بتا دوں مگر جب لکھنے بیٹھتی ہوں تو ؏

ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

اور پھر کچھ بھی نہیں لکھ سکتی۔۔ نہ معلوم کیوں؟

آپ نے جو سماج اور سوسائٹی کے متعلق لکھا ہے وہ ایک بڑی حد تک صحیح ہے

مگر معاف فرمائیے موہن صاحب! آپ پھر مرد ہیں۔ مرد اپنی تنگ نظری سے مجبور ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ عورت کی آزادی ہرگز ہرگز ایسی چیز نہیں کہ آپ لوگ اس کی یوں تاویلیں کرنے لگیں۔ بلکہ ایک پابگل عورت دوسری آزاد عورتوں سے کچھ زیادہ ہی محتاج رہتی ہے۔ اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہے۔ اس میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ اپنی خدمت گذاری سے کسی شوریدہ سر کو سیدھی راہ پر ڈال دے۔ عورت غیر محدود آزادی نہیں چاہتی بلکہ صرف اسی قدر مانگتی ہے جتنا اس کا پیدائشی حق ہے۔ مگر حیف کہ یہ "تنگ ظرف" اس بیچاری کو اتنی بھی آزادی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کو چمکار چمکار کر کہتا ہے ؎

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی
سُنی ضرور ہے، دیکھی نہیں کہیں میں نے

پھر اے نیک بخت! اَن دیکھی چیز تجھے کیسے دے دوں۔

آپ نے ازدواجی زندگی اور محبت کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے مجھے اِس سے بھی اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا ہے:۔

"ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ بدنصیب ویسی ہی بے بس، ویسی ہی مجبور، ویسی ہی مظلوم رہتی ہے جیسی پہلے تھی۔ مرد کے ہاتھ میں اس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں۔ جب تک چاہے اس سے دل بہلائے۔ جب چاہے اٹھا کر پھینک دے۔ توڑ ڈالے۔ بدل لے۔ آزاد ہے، مختار ہے۔"

لیکن موہن صاحب سچ تو یُوں ہے کہ اس میں مرد کا کوئی قصور نہیں قصوروار ہم ہیں۔ عورت اگر چاہے تو مرد کو گھر میں بٹھا کر چکی تک پسوا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں "عورت پن" موجود ہو۔ میں کہتی ہوں کہ دُنیا کے کسی مرد کی مجال نہیں جو عورت کے حکم سے سرتابی کرے۔ مگر کیا کیا جائے۔ جبکہ موجودہ فضا میں عورت نے اپنا "عورت پن" ہی کھو دیا۔

آپ کو شاید ایک عورت کے قلم سے ایسے الفاظ لکھے دیکھ کر تعجب تو ہو گا! مگر بندہ پرور! میں کوئی گل تو نہیں ہوں کہ جو خاموش رہوں۔ پھر جس طرح آپ شاعری میں "حال" اور "آپ بیتی" کے قائل ہیں۔ اسی طرح میں بھی اس معاملے میں "حقیقت پسند" ہوں۔

عجب تماشہ ہے آپ مرد ہو کر مردوں سے بیزار ہیں۔ اور میں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی عورتوں کی مخالف۔ خیر۔ خدا نے چاہا تو یہ مسئلہ بھی ایک نہ ایک دن حل ہو ہی جائے گا۔ اچھا خدا حافظ۔ ہاں "پردے" کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ پتا حسب ذیل ہے لیکن صرف انگریزی میں لکھئے گا۔ خدا آپ کو شاد رکھے۔

طالب توجہ

ناہید جمال

خط نمبر ۶

کشن گنج دہلی

۱۶ر جون ۱۹۳۲ء

محبِّ عزیز تسلیم!

کتنے دن ہوئے کہ آپ کا ایک خط مجھ کو ملا تھا۔ مگر بُرا ہو اس بیماری کا کہ آج بارہ تیرہ دن بعد جواب دینے کے قابل ہوئی ہوں۔ موہن! آپ مجھ کو بناتے ہیں یا میں آپ کو۔ بھلا میری کیا ہستی ہے جو میں آپ کو بناؤں۔ ع

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

مگر نہیں، سچ تو یوں ہے کہ غلطی خود میری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ اپنا بھونڈا سا نام آپکو بتا دیا۔ خیر آئندہ را احتیاط۔ موہن پہچاننے والے نے پہچان تو لیا۔ مگر اب بھی حالت کچھ گومگو کی سی ہے۔ شاید عقلمند چمکتی ریت پہ دھوکا نہیں کھاتے۔ کیوں! آپ نے لکھا ہے کہ "مگر میرے متعلق تو تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ ایک دور افتادہ' مجہول الحال' گمنام اجنبی کو جس کی صورت تک تم نے کبھی نہیں دیکھی۔ کس طرح تم نے ایک دوست اور ایک خالص دوست سمجھ لیا ہے؟" مگر آپ کیسے کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو نہیں سمجھا۔ نہیں دیکھا۔ اگر دیکھ لیا ہو تو؟ ثبوت؟ اچھا یونہی سہی۔ ذرا آنکھیں بند کیجئے کیوں، کچھ دیکھا؟ دیکھئے وہ سامنے سے ایک بزرگ فرشتہ صورت' جن کی لمبی

نورانی داڑھی ناف تک آ رہی ہے۔ زُلفیں شانوں تک لہرا رہی ہیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک (نور) ہے۔ سُرمہ باہر تک پھیلا ہوا ہے۔ مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ہیں ہمارے مخلص دوست "موہن!" اور آپ کہتے ہیں کہ میں نے موہن کو نہیں دیکھا چھی۔ چھی۔

موہن! آپ نے لکھا ہے۔ "اگر کسی وقت تمہیں میرے عیوب کا علم ہو گیا تو کیا تمہیں مایوسی نہ ہو گی؟" لیکن میں پوچھتی ہوں موہن مایوسی کسے ہوتی ہے؟ مایوسی تو اُسے ہو جو کسی سے کوئی غرض رکھتا ہو۔ میں تو آپ سے کوئی غرض نہیں رکھتی ہیں تو ہمیشہ آپ کو پردے میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہماری جان پہچان تو دوستی تک محدود ہے۔ پھر مایوسی کیسی؟

آپ میری سرگذشت سُن کر کیا کریں گے؟ ہمدردی! وہ تو بغیر سُنے ہی آپ کرتے ہیں۔ آپ نہیں مانتے تو سُنئے۔ مگر اُکتا نہ جائیے گا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ جیسا کہ دنیا میں دستور اور فطرت کا تقاضا ہے۔ والدین مجھ کو بیحد چاہتے ہیں والد نے خاطر خواہ تعلیم دلوائی۔ ہنوز مسلم گرلس اسکول لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں مگر اب والدین کہتے ہیں کہ میں تعلیم چھوڑ کر۔ . . . . کر لوں۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ جس سے نہ معلوم کیوں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر میں نہیں کرنا چاہتی اور نہ اُس وقت تک کروں گی جب تک تقاضائے فطرت کے سامنے میں خود نہ جُھک جاؤں۔ بہر حال اب تک میں نے یہ کہہ کر کہ ابھی اور تعلیم حاصل کرنا چاہتی

ہوں۔ ان کو ٹالا ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ یہ حالت زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہے گی خیر بس یہی میری سرگذشت کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ ضمناً اگر میں یہ بھی لکھ دوں کہ والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کے سبب سے ان کی لاکھوں کی جائداد کی تنہا وارث ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہی ایک ایسی بات ہے جو طرح طرح سے مجھ کو پریشان کرتی رہتی ہے۔

میں آپ سے صرف اتنا چاہتی ہوں کہ . . . . موہن! خدارا مجھ کو ایسی باتیں نہ تحریر کیا کیجئے۔ بنصیبِ دشمناں میں اور آپ کے لئے دعا مانگوں۔ موہن! آپ کو کسی دوست سے جو شاید آپ کا ایک عزیز دوست ہے (غلط تو نہیں؟) کیا ایسی ہی امید رکھنی چاہیئے۔ مرنے کا لطف تو جی جی کر مرنے میں ہے۔ خود غالب کہہ گئے ہیں۔

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

موہن! خدا تم کو صبر دے۔ گو میں نہیں جانتی کہ آپ کن جذبات کے ماتحت ایسی باتیں تحریر کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی میرے دل کی گہرائیوں میں سے یہی دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے آپ کے "درد" میں کمی نہ ہو۔ شاید مرنے والی (خدا مغفرت کرے) کی بھی یہی آرزو ہو گی۔ کتنی خوش نصیب ہو گی وہ جو آپ پر سے قربان ہو گئی۔ اور محبت کا حق ادا کر دیا۔ ایک آپ ہی ہیں شاید آپ کے دل کا حال جانتی ہوں۔ آپ نے "اس" سے محبت کی۔ پہلے پہل آپ ہر وقت بے چین اور بے قرار رہا کرتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا آپ کا جوش بھی ٹھنڈا پڑتا گیا۔ اور اب وہ حالت تو نہیں رہی تاہم

کبھی کبھی کسی چیز یا کسی جگہ کو دیکھ کر یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ پہلا سا درد نہیں ہوتا۔ بس ایک لمحہ یا کچھ زیادہ دیر کے لئے آپ تھوڑے سے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ بس موہن! میں اتنا ہی چاہتی ہوں ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ اجنبی رہیں۔ آپ اپنی رودادِ غم مجھ کو سنایا کیجیے، میں تسلی دیا کروں۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ فقط۔

اُمیدوارِ عنایت

ناہید جمال

خط نمبر ۷

لکھنؤ

۱۶ر جولائی ۱۹۳۲ء

عزیز موہن! تسلیم۔

شاید ؎

وابستہ میری ذات سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

اچھا کیا کہ مجھکو فراموش کر دیا

نہیں تو پھر میرے ان کردہ گناہوں کی سزا ہو گی۔ موہن! میں نے آپ کے ۵ رمئی کے خط کا جواب مسز بخشی کے پتے پر دیا تھا۔ مگر شاید بدقسمتی سے وہ آپ کو نہیں ملا

جب سے آپ کے خط کا انتظار کرتے کرتے یہ وقت آ گیا ہے۔ خط خواہ کسی کا بھی کیوں نہ ہو اُس کے آنے تک دل میں ایک عجیب الجھن سی رہتی ہے۔ کجا پھر آپ کا خط۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں۔ کالج کھل گیا ہے۔ ادھر غالباً آپ بھی مصروف ہوں گے۔ خدارا جلد جواب دیجئے گا۔ میرے دونوں خطوں کی رسید لکھئے گا۔ تب تک میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔ امید ہے آپ اچھی طرح ہوں گے۔ فقط۔

منتظر

ناہید

خط نمبر ۸

لکھنؤ

۲۶ر جولائی ۱۹۳۲ء

موہن!

میں نے سوچا۔ آپ کو ہندی لفظ میں عربی کی آمیزش[1] نہیں بھاتی اور ادھر بحیثیت ایک مسلمان کے میں عربی پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ یہی سوچ کر اس کا جھگڑا ہی مٹا ڈالا۔

---

[1] م۔ س نے پچھلے خط میں "عزیز موہن" کے متعلق لکھا تھا۔ کہ "عزیز عربی۔ موہن ہندی۔ کاش تم نے عزیز کے بجائے تمنے اس کا ہم معنی ہندی لفظ لکھا ہوتا۔" ناہید نے جواب میں اس مرتبہ فقط "موہن" سے خط کا آغاز کیا۔

موہن ہندی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں دلبر، محبوب اور محبوب ہر حال میں پیارا ہوتا ہے۔ پھر خواہ مخواہ اس میں "پیارے" کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ وہ تو بغیر "پیارے" کے پیارا ہے (آپ کے لئے اس کی قید نہیں) اور پھر موہن! "پیارے بہت معمولی لفظ ہے اور شاید بازاری بھی۔ میرا دل تو اس سے کہیں زیادہ چاہتا ہے۔

پیارے موہن!

ہو سکتا ہے کہ انسان کی زندگی مصیبت و آلام اور مایوسی سے لبریز ہو مگر آپ کے بارے میں تو یقیناً غلط ہے۔ موہن اگر آپ میری امیدوں کے خلاف بھی نکلے (جس کا کوئی امکان نہیں)، تو بھی مجھے مایوسی نہ ہو گی کیوں؟ اس کا شاید میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میں حیران ہوں کہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو میرے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ موہن! عورت جب محبت کرتی ہے یا کسی کو چاہتی ہے تو آنکھیں بند کر کے چاہے جاتی ہے۔ تاآنکہ وہ نیند اس کو نہ آجائے جو سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ وہ چاہے جاتی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ "سب کچھ دے لو اور کچھ نہ دو ـــــ" خدا نہ کرے کہ مجھے کسی سے محبت ہو جائے۔ خدا کرے میں کسی کو نہ چاہوں ـــــ ورنہ پھر میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ یہ محبت کم بخت انسان کی عقل کو مغلوب کر کے جذبات کو اس پر حکمراں کر دیتی ہے۔

موہن! تم نے لکھا ہے کہ "ناہید! تمہارے اس خط کو پڑھ کر میرا دل بجھ گیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہماری دوستی کے خاتمے کا وقت آ پہنچا ہے" ـــ اور

دوستی انہیں لوگوں میں قائم رہ سکتی ہے جو دنیوی حیثیت سے ہم رتبہ ہوں "۔

موہن! اگر اس سے آپ کا مقصد جی جلانا یا میرا امتحان لینا نہیں ہے۔ تو خدا را ایسے الفاظ تحریر نہ کیا کیجئے۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے جو ان لفظوں کی تاب لا سکوں۔ مانا کہ میں ایک حد تک دولت مند ہوں۔ مگر آپ بھی تو کنگال نہیں ہیں۔ اور پھر میری نظر میں کاش! آپ جانتے کہ آپ کیا ہیں ؟

میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

موہن! اگر دنیا میں سچائی کا وجود ابھی باقی ہے تو یقین کیجئے گا۔ کہ آج تک ایسی شخصیت کا انسان میری نظر سے نہیں گذرا۔ گو میں نے آجتک آپ کو نہیں دیکھا مگر جو تخیل میرے دل میں ہے مجھے امید ہے کہ آپ اس سے کہیں سوا ہوں گے۔ اور کیوں نہ ہوں۔ ؟

جب کبھی میں یہ خیال کرتی ہوں کہ دنیا میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو مجھ کو بلا کسی ذاتی غرض کے ایک عزیز دوست خیال کرتا ہے۔ تو مجھ کو روحانی خوشی ہوتی ہے ایسی خوشی کہ مانو میری روح کو جو اکثر خوشی کی تلاش میں بھٹکا کرتی تھی۔ ایک قلبی اطمینان نصیب ہو گیا ہے۔ ایسا اطمینان جو اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ سچی خوشی کا ایک لمحہ میرے لئے بہت ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے۔

اب رہا سوال سوسائٹی کا تو موہن اوّل تو ابھی اُس بات کے لئے ایک زمانہ چاہیئے دوسرے میں یا میرے ماں باپ اتنے اندھے نہیں ہیں۔ جو کسی ذاتی لالچ یا کسی دباؤ

سے میرا دامن کسی ایسے شخص کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ جو درحقیقت میرے قابل نہ ہو اور اگر قسمت سے وہ وقت آ بھی گیا۔ تو میں نہیں جانتی۔ کہ میں کیا کروں گی ــــ مگر اس کی فکر ابھی سے کیوں ہو؟

آپ لکھتے ہیں "میں حیران ہوں کہ تم جیسی ایک ناتجربہ کار لڑکی محبت کے تعلقات کی نوعیت کو اس درجہ صحیح کیوں کر سمجھ سکتی ہے۔"

نہیں موہن۔ بات صرف اتنی ہے کہ شاید ع

پریشاں کی پریشانی پریشاں ہی سمجھتے ہیں

موہن! غلط فہمی میں نہ پڑو۔ میرا مطلب "اجنبی" سے خدانخواستہ یہ نہ تھا کہ میں آپ پر کسی قسم کا شک کرتی ہوں یا اِس معصوم فرشتہ سے بیزار ہوں۔ نہیں، بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ ہم کو ایک دوسرے کے نجی حالات کبھی نہ معلوم ہونے چاہئیں۔ مگر آپ نے نہ مانا۔ اب دیکھ لیجئے کہ آپ کو میرے حالات معلوم کر کے دکھ ہوا یا نہیں؟

موہن! ہمدردی اور محبت میں بہت کم فاصلہ ہے۔ شاید میرے لئے یہی بہت ہے کہ آپ کو ایک شریف ہمدرد مجھے آپ کی دوستی پر فخر حاصل رہے۔ اور کیوں نہ ہو؟

"موہن کی یہ آرزو ہے کہ اس کی ایک نشانی اس کے عزیز دوست کے پاس رہے" موہن! آپ کی بہت سی نشانیاں تو پہلے ہی سے میرے پاس رکھی ہوئی ہیں۔ چاہے آپ ان کو نشانیاں نہ سمجھیں۔ جب میرا جی گھبراتا ہے تو آپ

کے خطوط لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ فرمائیے۔ کہ اس سے بہتر اور کیا نشانی ہو سکتی ہے؟ ہاں شاید ایک ——— آپ کی تصویر۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مگر پھر بھی مجھے آپکی نشانی خواہ وہ کوئی چیز ہو، لینے میں انکار نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ آئندہ اس قسم کی ضد نہ کی جائیں۔ پتا وہی ہوگا جو آپ کو معلوم ہے۔

میں یہاں اپنے ہی مکان پر رہتی ہوں۔ در اصل ہم لوگ رہنے والے تو دلّی کے ہیں مگر چونکہ لکھنؤ میں عرصے سے تجارت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے ہم لوگ اب مستقل طور پر لکھنؤ ہی میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا پورا خاندان اور دیگر عزیز دہلی ہی میں ہیں۔

میں اچھی ہوں، موہن بالکل اچھی۔ جس کو آپ جیسا ہمدرد مل جائے وہ کیوں بیمار ہونے لگا۔ ہاں موہن میں تو آپ سے چھوٹی ہوں "آپ" مجھے اچھا نہیں لگتا میں تو "تم" ہی کو اچھا سمجھتی ہوں۔ اب آئندہ احتیاط رہے۔ نہیں تو میں لکھوں گی: "مولینا ... صاحب"۔ مجھے آپ۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ فقط۔

طالب توجہ

ناہید

مجھے آپ کے دونوں خط بھی مل گئے۔ جو آپ نے دلّی اور لکھنؤ لکھے تھے۔

خط نمبر ۹

لکھنؤ

۱۲ اگست ۱۹۳۲ء

موہن!

کہانیاں تو آپ نے بہت سی سُنی ہوں گی۔ ایک کہانی کل مجھ پر بیت گئی۔ شام کو تقریباً چھ بجے ہوں گے کہ میری سہیلی رضیہ دوڑتی ہوئی آئی اور آپ کی بھیجی ہوئی نشانی میرے ہاتھ میں دی۔ سچ جانا موہن۔ اس کو لے کر میرا دل عجیب طریقے سے دھڑکنے لگا۔ اس کے جانے کے بعد جب میں نے پارسل کھولا۔ تو موہن اس میں سے جو کچھ نکلا وہ میری امید کے سراسر خلاف تھا۔ نہیں، موہن میں اس کی مستحق نہیں۔ میرے لئے وہ بہت قیمتی ہے ——— موہن، نشانی وہ اچھی ہوتی ہے جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔ موہن اگر یقین کرو۔ تو ایک بات کہوں۔ میں سچ کہتی ہوں موہن مجھ کو تمہاری نشانی دیکھ کر بجائے خوشی کے رنج ہؤا ——— کیونکہ موہن .... مَیں اِس قابل نہیں ہوں۔ نہ معلوم کیوں اِس کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا ——— اب بتاؤ، موہن میں کیا کروں۔

تمہاری گنہگار

ناہید

خط نمبر ۱

لکھنؤ

۱۸ اگست ۱۹۳۲ء

تمہارے خط کو دیکھ کر نظر اُسی میں گھر گئی
تمہاری شکل خط کے ساتھ پتلیوں میں پھر گئی

موہن!

تم کتنی جلد بدگماں ہو جاتے ہو۔ خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہ تھا کہ تمہاری نشانی پا کے مجھے ذرا خوشی نہیں ہوئی۔ بلکہ موہن (دیکھو بُرا نہ ماننا) میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے لئے کچھ بھی بے جا صرف نہ کریں۔ مجھے اس سے روحانی تکلیف ہوتی ہے۔

اور ہاں موہن، جائیے مَیں آپ سے نہیں بولتی۔ ایک دفعہ میں نے آپ سے آپکی تصویر مانگی تھی، مگر بھیجنا تو درکنار آپ نے تو اس کا جواب تک نہیں دیا۔ اس لئے میں اب کبھی نہ مانگوں گی۔ اور نہ آپ بھیجئے گا۔ میں سمجھوں گی کہ جس طرح انسان نے آجتک خدا کو نہیں دیکھا، مگر پھر بھی اُسے چاہتا ہے۔ اسی طرح مَیں موہن کو کبھی نہ دیکھونگی۔ دیکھئے اگر میں نے آپ کی ایک بیش قیمت نشانی قبول کر لی، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اب آپ چادر سے باہر پاؤں پھیلانے لگیں۔ میں پھر کہتی ہوں کہ آپ میرے لئے کچھ بھی اور کسی حالت میں بھی اگر صرف کریں گے تو مجھ کو افسوس ہو گا

موہن! خدا کے لئے غلط فہمی میں نہ پڑ جائیے گا کسی ٹوٹے ہوئے تار کو نہ چھیڑو۔ اس میں نغمہ نہیں ہے۔

موہن میں سمجھتی ہوں کہ دنیا میں بدترین گناہ دل آزاری ہے چونکہ میرے گذشتہ خط سے آپ کو افسوس ہوا، اس لئے ناہید آپ کی گنہگار ہوئی۔ کیوں اب معاف کرتے ہیں۔ آپ اُسے ؎

لو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے ہم تمہارے سامنے

آپ نے میری تصویر مانگی ہے۔ کیوں؟ موہن! میرے پاس اپنی دو تصویریں ہیں۔ ایک فوٹو۔ دوسری قلمی۔ اب جو آپ کہیں وہ بھیج دوں۔ مگر میں جانتی ہوں کہ آپ اس کو پسند نہ کریں گے۔ مگر خیر مجھ کو کچھ اعتراض نہیں۔ فرمایئے کب اور کون سی بھیج دوں۔ لیکن موہن اس میں ایک شرط ہے۔ وہ آپ کو منظور کرنا ہوگی۔ وہ یہ کہ جب آپ میری تصویر دیکھ چکیں تو فوراً اس کو جلا ڈالیئے گا۔ کہیئے منظور ہے؟

موہن! اس وقت جب کہ مَیں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے۔ دل بہت اُداس ہے۔ نہ معلوم کیوں۔ آپ کا ایک شعر رہ رہ کر زبان پر آ رہا ہے ؎

.... ۛ ....

اچھا موہن اب خدا حافظ۔ آپ نے لکھا ہے کہ "کاش! تمہاری گنہگار ناہید کے بجائے تمہاری ناہید لکھا ہوتا۔" اچھا خیر یوں ہی سہی۔

تمہاری
ناہید

خط نمبر ۱۱

(یکم ستمبر ۱۹۳۲ء)

فریب خوردۂ رنگینئ بہار رہوں میں

تنہائی کے باعث جب بہشت میں آدم کا جی گھبرایا تو اُنہوں نے خدا سے فریاد کی کہ اے معبود میں اِس فضائے لاانتہا میں یکہ و تنہا کب تک رہ سکوں گا۔ چنانچہ خدا نے رحم کھا کر اُن کی "دل چسپی" کے لیئے حوّا کو پیدا کیا اور اس طرح "عورت" وجود میں آئی۔ ..... صدیاں گذر گئیں۔ ..... دُنیا کو بسے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا کہ ایک دن ایک فرشتے نے خدا سے سوال کیا کہ اے خالق کائنات تُو نے آدم کے واسطے عورت کو پیدا کیا۔ جو اس کی مونس و شریکِ زندگی بنی۔ ... مگر اے معبود تُو نے اُس کمزور عورت کا بھی کچھ خیال کیا؟ آخر اُس کو بھی تو ایک ہمدرد اور ایک "دوست" چاہیئے جس سے وہ سب کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ خدا نے جواب دیا کہ ہاں میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ وہ اس کا شوہر ہو گا۔ ....

فرشتہ خاموش ہو گیا لیکن یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں اس کا شوہر اور ہمدرد و دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اس نے خدا سے پھر التجا کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ .... کچھ عرصہ گذرنے پر خدا نے محسوس کیا کہ فرشتہ سچ کہتا تھا۔ .... پس اُس نے ایک فرشتہ کو بلا کر کہا کہ

"جاؤ" چاروں عناصر لے آؤ۔ ہم نے اپنی قوتِ تخلیق سے ایک نیا تخیل پیدا کیا ہے" فرشتے نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اے خالق! جب تُو نے تخلیق کے جذبے سے بے اختیار ہو کر اپنے کارخانۂ قدرت کا سارا سامان بے دریغ خرچ کر ڈالا اور اپنے ذخائر پر ذرا بھی نظر نہ کی۔ تو اب اے معبود! عناصر اربعہ بہت ہی قلیل مقدار میں باقی رہ گئے ہیں حکم ہوا کچھ پروا نہیں۔ جاؤ وہی لے آؤ۔ پس اُس قلیل مقدار عناصر سے خدا نے اپنے تخیل کو جامۂ ہستی پہنایا۔ . . . . یہ ہستی دوست کی تھی۔ عورت کے ہمدرد دوست کی، مگر اتفاق دیکھئے کہ غلطی سے اس کے خمیر میں بجائے ہمدردی کے: . . . . خود غرضی . . . . ملا دی گئی . . . . اور اس طرح عورت کی زندگی صحیح معنوں میں تلخ ہو گئی۔ اس کو اپنا حسن بلکہ اپنی زندگی وبال معلوم ہونے لگی۔ اِس لئے ایک دن موقع پاکر اُس نے خدا سے دُعا کی کہ اے معبود! اے خالق! تُو نے میرے لئے، میری ہمدردی کے لئے ایک دوست پیدا کیا تھا۔ مگر اے میرے رب! وہ مرد ہے . . . . . ایک "تنوع پسند" مرد ——— اِس لئے اے خالق میرے لئے کوئی دوسری ہستی پیدا کر جو صحیح معنوں میں میری رفیق بن سکے۔ آواز آئی۔ اے عورت! جو کچھ میرے پاس تھا۔ وہ سب ہم نے لٹا دیا . . . . اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب یہ تیرا فرض ہے کہ اس کی خود غرضی کو بے غرضی میں تبدیل کر دے۔ ہم نے اپنا کام ختم کر دیا . . . . ہزارہا برس سے عورت اِس "اِنسان" کو دوست بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اس کو کہاں تک کامیابی ہوتی ہے !!! - !!!

تعجب ہے کہ آپ اتنے سمجھدار ہو کر اب تک یہ نہ سمجھ سکے کہ دنیا میں اور خاص کر دنیائے محبت میں عورت کبھی پہل نہیں کرتی۔ میرے بھولے موہن، تم نے ایک ذرا سی غلط فہمی سے واقعات کو حد درجہ افسوسناک بنا دیا ہے۔ اور وہ بھی میری تحریر کی خامی سے متاثر ہو کر۔ اِس لئے موہن میں اِس کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ تم غلطی سے ایک ناخوشگوار غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ اِس لئے محبوب، تمہاری ناہید تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے کہ معاف کر دو۔ موہن! دُنیا میں بدنما سے بدنما خطا سے درگذر کیا جاتا ہے سخت سے سخت قصور کو معاف کر دیا جاتا ہے —— اِس لئے پیارے موہن کیا تم اپنی بلند ہمتی اور بلند نظری کے صدقے میں ناہید کو معاف نہیں کر سکتے۔

موہن، خدا شاہد ہے میں اب بھی تم سے تعلقات قطع نہیں کر سکتی کسی حالت میں بھی نہیں۔ تمہاری عزت میرے دل میں وہی ہے اور رہے گی۔ موہن! اچھے موہن، مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں کہ یہ خط تمہاری امیدوں کے بالکل برعکس ہوگا۔ اس کو پڑھ کر تمہارے حساس دل پر چوٹ لگے گی۔ تم کو رنج ہوگا۔ مگر پھر بھی موہن، تم کو اس کا واسطہ دے کر کہتی ہوں جس کو تم نے دنیا میں سب سے زیادہ پایا۔ مجھے معاف کر دو۔ موہن، اگر میں بدل گئی تو تم تو نہ بدلو۔ دیکھو ناہید تم سے دامن پھیلا کر معافی چاہتی ہے —— کہہ دو معاف کر دیا

فقط تمہاری

بدنصیب و گنہگار ناہید

خط نمبر ۱۲

۸ ستمبر ۱۹۳۲ء

شک بھی کس پر مری محبت پر
جس کا تو خود گواہ ہے پیارے

"ناہید، للہ اب رحم کرو۔ میری برداشت کی قوت اب بالکل ختم ہو چکی ہے۔" اور پھر "تم نے مجھے کافی تو بنا لیا" موہن تم ایک مرد ہو اور میں ایک کمزور عورت۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ دل شکن حملے میں برداشت کر سکوں گی۔ نہیں، موہن، نہیں۔ زندگی میں مَیں نے بہت سے مرد دیکھے سینکڑوں، ہزاروں، مگر میرے آئینۂ دل پر اُن کے حُسن یا قابلیت کا ایک خط بھی نہیں پڑا۔ لیکن نہ معلوم کیوں، تمہاری تحریر پڑھ کر، تمہارے متعلق سُن کر، مجھے خیال ہوا کہ جیسے میں تم کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ اور تم مجھے مل گئے۔ موہن! محبت کرنے والے تو دس مل جاتے ہیں مگر ایک سچا، بے غرض دوست بہت مشکل سے ملتا ہے میرے دل نے گواہی دی تھی۔ کہ تم میں وہ سب اوصاف موجود ہیں۔ جن کی تلاش میں میری روح بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اِسی لئے میں نے لکھا تھا کہ اگر تم میری امیدوں کے خلاف بھی نکلے تو بھی مجھے مایوسی نہ ہوگی۔ موہن! تم نے جو کچھ کیا اُس کے لئے تم مجبور تھے۔ صرف تم ہی نہیں بلکہ ہر مرد (شاید وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے) لیکن موہن ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عورت ہم سے مکّاری کر رہی ہے اور

بعض اس کو ایک حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ پیارے موہن سوچو، ہمیں ایک پھول اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ جس درخت کی شاخ پر کھلا ہے۔ وہ درخت ہمارا نہیں۔ بلکہ وہ چمن جس میں وہ درخت ہے وہ بھی ہمارا نہیں۔ پھر اس پھول پر قبضہ کر لینے کے ہم کس طرح مجاز ہیں ؟ ہاں اگر اُسے دیکھنے کی اجازت مل جائے یا اُس کے حسن سے محبت بھری آنکھوں کو شاد کر لینے کا موقع مل جائے تو بھی غنیمت ہے۔ اس لئے موہن جس پھول کو تم حاصل کرنا چاہتے ہو۔ وہ ایک کارِ دشوار ہے اس لئے کہ وہ خود اس کا مجاز نہیں کہ کسی کے گلے کا ہار بن جائے جب تک کہ اس کے مالک (والدین) اس کو اجازت نہ دیدیں۔ ہاں وہ اپنی خوشبو سے تم کو مسرور کر سکتا ہے۔ وہ تمہارے زخمی دل کے لئے مرہم کا کام کر سکتا ہے مگر . . . . .

موہن! تم نے مجھے چاہا مگر میں نے کوئی التفات نہیں کیا۔ اچھا نہیں کیا۔ مگر میں تمہاری محبت کی معترف ضرور ہوں۔ بلکہ ایک حد تک خود بھی تم کو چاہتی ہوں پھر تم کیوں شکایت کرتے ہو موہن میں نے تم سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم مجھے نہ چاہو۔ تب یہ جھگڑا کیسا؟ تم چاہتے ہو، شوق سے چاہو۔ کیوں کہ کسی کو چاہنا گناہ تو ہے نہیں۔ لیکن مجھ سے وہ چیز نہ مانگو جس کے دینے کی نہ مجھ میں قوت ہے اور نہ اجازت۔ اچھے موہن! ذرا میری بدقسمتی پر غور کرو کہ میں کتنی بدقسمت ہوں کہ ایک قابلِ قدر ہستی مجھے دعوتِ محبت دے رہی ہے، اور میں ٹھکرا رہی ہوں۔ کاش خدا نے مجھے اتنا مجبور نہ بنایا ہوتا۔ کاش میں عورت ہی نہ ہوتی۔ ممکن ہے موہن کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ تم اُسے عام عورتوں کا سا فریب سمجھو۔ مگر موہن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ لفظ بہ لفظ درست

ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اپنی جنس سے نفرت کرتی ہوں تو یہ ایک مبالغہ ہو گا مگر یقین کرو کہ میں ایک عورت نہیں۔ میرے سینے میں وہ دل ہی نہیں ہے۔ میں ایک ستم نصیب، مقید چڑیا ہوں، جس کو نہ فریاد کی اجازت ہے نہ تڑپنے کی جس طرح عقاب اپنے شکار کو مشکل سے چھوڑتا ہے۔ اسی طرح میرے عقابوں کی نظریں میرے اوپر لگی ہوئی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح مجھ کو حاصل کر کے میری دولت پر قابض ہو جائیں اسی لئے موہن، اس ماحول سے گھبرا کر میں نے حسرت سے تمہارا دامن پکڑا تھا۔ اب تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تم سے قطع تعلق کر لوں۔ مگر موہن یہ کبھی نہ ہو گا۔ ایک لاچار لڑکی کی مدد کرنا تمہارا پہلا فرض ہونا چاہئے۔ آہ موہن!

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد

کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت

غنچۂ باغ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

موہن! اچھے موہن، مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے تم کو دانستہ ایک دکھ دیا ہے، مگر خدا کے لئے اپنی بلند نظری کا صدقہ مجھے معاف کر دو۔ کہہ دو معاف کیا۔

تمہاری بخشش کی طلبگار

ناہید

خط نمبر ۱۳

دہلی

۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

پیارے موہن!

دنیا والے ازل سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ عورت بظاہر حُسن و رعنائی کا ایک مجسمہ ہے لیکن باطن میں ایک زہریلی ناگن۔ اور مجسم بے وفائی ہے۔ اچھا موہن تمہارے پاکیزہ خیالات تو میں تمہارے افسانے "۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میں پڑھ چکی ہوں مگر ایک بات میں، میں بھی اِن دُنیا والوں سے اِتفاق کرتی ہوں۔ شاید حسین عورت عموماً بے وفا ہوتی ہے۔ یا کم از کم اپنی زندگی میں ایک بار وہ مرد کے ساتھ کھیلتی ضرور ہے بعض اوقات تو وہ اپنے حسب منشا اُس کھیل کو جب اُس کا دل بھر جاتا ہے ختم کر دیتی ہے۔ اور یہ تک بھول جاتی ہے کہ وہ کون تھا اور اب کیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جب اِس کھیل کو کھیلتے کھیلتے وہ اچانک یہ محسوس کرتی ہے کہ کھیل، کھیل نہیں رہا۔ بلکہ ایک حقیقت بن گیا۔ تو وہ کانپ اُٹھتی ہے۔ اپنے کئے پر پشیمان ہوتی ہے۔ روتی ہے، آہ و زاری کرتی ہے اور بالآخر سیدھی راہ سے بھٹک جاتی ہے۔ انجام اس کا وہی ہوتا ہے جو قدرت نے

ایسے مجرموں کے لئے مقرر کر دیا ہے۔

موہن! یہ طویل تمہید میں نے اِس لئے لکھی کہ بدقسمتی سے میں بھی اُس تلخ حقیقت کا شکار بن چکی ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے تم کو ایک کھلونا کبھی نہیں سمجھا۔ میں نے تمہارے زخم پر مرہم رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اپنی نادانی اور پھوٹے نصیبے سے چھڑک دیا اُس پر نمک۔ جس چیز کو میں نے تمہارے لئے تریاق سمجھا، وہی چیز زہر ہو گئی۔ نجومی نے سچ کہا تھا۔ تم نے ایک نئی مگر نہایت خطرناک محبت شروع کی ہے۔" موہن بھول جاؤ اِس خطرناک محبت میں نہ پڑو، جو تمہارے لئے باعث مسرت نہ ہو گی۔ سمجھنا ایک بے وفا بے غیرت کمینی نے دھوکا دیا، بھول جاؤ موہن تم کو اپنی سب سے عزیز شے کی قسم۔ میرے لئے ایک کمینی ایک بے حیا کے لئے کیوں دل دکھاتے ہو اپنا۔

آج ایک مہینے کی مسلسل بیماری سے اس قابل ہوئی ہوں کہ تم کو یہ چند سطریں لکھ سکوں۔ ڈاکٹروں نے قلم پکڑنے اور کتاب دیکھنے کو قطعی منع کر دیا ہے۔ میں ایک مہینے سے دہلی میں ہوں۔ خیال ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں لکھنؤ واپس چلی جاؤں گی۔ اِس وقت شام ہو رہی ہے۔ نرس دوا بنانے گئی ہوئی ہے۔ میرے سامنے تمہاری نشانی ہے لیکن میں اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ تمہارے دونوں خط کل لکھنؤ سے رضیہ نے بھیجے ہیں۔

ہاں موہن، تم میرے متعلق (I.T) آئی۔ٹی کالج کی پروفیسر مس ہنٹ سے تحقیقات کر سکتے ہو۔ میرا نام ناہید جمال یا جمال فاطمہ ہے۔ فرسٹ ایر کے رجسٹر میں تم کو میرا نام مل جائے گا۔ بس خوش رہو۔ اپنی بے وفا کو کبھی کبھی یاد کر لینا۔ بھول

نہ جانا۔

بیمار

ناہید

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا۔ وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

.... c/o

خط نمبر ۱۴

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء

میں آج واپس لکھنؤ جا رہی ہوں

ناہید

خط نمبر ۱۵

لکھنؤ

۱۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء

موہن! تم کہاں ہو؟ ایک خط دہلی سے روانہ کر کے میں اچانک لکھنؤ روانہ ہو گئی

جب سے اب تک معلوم نہیں کہ تم کانپور ہی میں ہو یا واپس چلے گئے۔ خدارا بتاؤ۔ میں ہنوز سخت بیمار ہوں۔ کوئی افاقہ نہیں۔ امید ہے تم بخیریت ہو گے۔

تمہاری

ناہید

خط نمبر ۱۶

لکھنؤ

۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۲ء   ایک بجے رات

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

کاش! خدا نے مجھے اتنی طاقت دی ہوتی کہ میں آسانی سے اپنی غیبت زندگی ختم کر سکتی۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ نیند مجھے نہیں آتی۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے اوپر سے تمہارے یہ دل شکن خطوط! کیوں موہن! کس گناہ کی سزا دے رہے ہو؟ مجھے معلوم ہو کہ تم لکھنؤ میں ہو۔ اور میں خاموش رہوں۔ تمہارا خط ملے اور میں جواب نہ دوں؟ کاش تم سوچتے۔ مگر خیر۔ نیرنگی قسمت سے کیا گلہ۔

نرس ابھی ابھی سوئی ہے۔ ورنہ شاید اتنا بھی نہ لکھ سکتی۔ موہن کیوں جلاتے ہو میرا یہ حال ہے کہ ؎

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو مرنے کی بھی امید نہیں

معاف کرنا۔ زیادہ نہیں لکھا جاتا۔ اگر کل تک زندہ رہی تو پھر کل خط لکھوں گی پھر لکھوں گی تا آنکہ . . . . .

بدنصیب
ناہید

خط نمبر ۱۷

لکھنؤ

۴ر نومبر ۱۹۳۲ء

یہی آنکھیں جو آج روتی ہیں — کبھی پیار سے ہنسا بھی کرتی تھیں
ان میں رہتی تھی اک ہنسی بن کر — وہ مسرت جو اب نصیب نہیں

بارہا سوچا کہ یہ دل کی دھڑکن، یہ بے چینی، یہ انتظار کیوں رہا کرتا ہے۔ مگر کبھی معلوم نہ ہوا۔ تم آئے ہیں نے حیران ہو کر تم کو خوش آمدید کہی۔ اچھا بتاؤ تم رسالہ "....." میں افسانے کیوں لکھا کرتے تھے؟ نام کے لئے! میں نہیں مانتی۔ تم مجھے ڈھونڈھ رہے تھے یا میں؟ اچھا تم مجھ کو میں تم کو کیوں اچھے لگتے ہیں؟ ہم دونوں اب تک ایکدوسرے کے لئے اجنبی رہے ہیں۔ پھر اس جلن کے کیا معنی؟ میں نے ہزاروں خوبرو دیکھے

مگر ان کا ایک ہلکا سا عکس بھی میرے دل پر نہ پڑا؟ گیا اس لئے کہ میں شریف ہوں؟ مگر مگر تم کو تو دیکھا تک نہیں۔ گو چاہا کئی بار —— یہی خیالات لیٹے لیٹے آتے رہتے ہیں۔ مگر ان کا تسکین دہ جواب آج تک نہ ملا۔ موہن! کاش میں مر جاؤں۔ سچ کہتی ہوں یہ زندگی کٹتے نظر نہیں آتی۔ ایک کشتی جس کا ناخدا نہ ہو، کب تک بے رحم موجوں کے رحم پر ٹھہر سکتی ہے؟ اور اگر کوئی ناخدا آ بھی گیا تو!

میری کشتی کو بچائے گا کہاں تک ناخدا

جانتا بھی ہے کہ منشائے خدا کچھ اور ہے

اچھے موہن! میں بیمار ہوں۔ یہ بھی نہیں معلوم کیا بیمار ہوں۔ پہلے دن دن بھر غشی رہا کرتی تھی۔ اب جلن رہتی ہے۔ تم آ جاؤ۔ تصویر کے روپ میں۔ آؤ گے؟ میں کیسے اپنی تصویر بھیج سکتی ہوں۔ باہر کوٹھی میں پڑی ہوں، تصویر دوسرے گھر میں ہے۔ رضیہ سے منگاؤں گی۔ پھر بھیج دوں گی۔ تم رنج نہ کرنا۔

اچھا اب ختم کرتی ہوں۔ سر چکرانے لگا۔ جواب جلدی دینا اور تصویر بھی جلد بھیجنا تنہائی میں طبیعت تم کو ڈھونڈھتی ہے۔ اس کی تسکین ہو جائے گی۔ خدا حافظ

تمہاری

ناہید

خط نمبر ۱۸

۲ر جولائی ۳۵ء

صرف تصویر جس کی پُشت پر لکھا تھا :-

"معاف کردو ـــــــ

بدنصیب

ناہید"

آخری خط

لکھنؤ

۲۲ر جولائی ۳۵ء شب

ہاتھ میں قلم ہے لیکن اُنگلیاں کانپتی ہیں۔ دل میں جذبات ہیں۔ مگر دماغ میں الفاظ نہیں۔ میں گناہگار ہوں۔ جفاکار ہوں۔ مجرم ہوں۔ سزا کی مستحق ہوں۔ لیکن پھر بھی ایک عورت ہوں۔ ستم رسیدہ، مجبور، لاچار، ایک ایسی عورت کے لئے آپ کے یہ اشعار نشتر سے کم نہیں۔

دنیا میں بدترین سے بدترین گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ سخت سے سخت جُرموں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ شرمناک سے شرمناک افعال سے درگزر کر لیا جاتا ہے

تو کیا میرا گناہ اتنا شدید ہے کہ وہ ہر حال میں ناقابلِ معافی ہے! کاش آپ کو میری مصیبتوں کا بھی علم ہوتا۔ لیکن آپ کو تو میرا خط دیکھتے ہی پہلا خیال جو گزرا وہ بقول آپ کے یہی تھا ع

کیا تمہیں اور کوئی تازہ ستم یاد آیا

اس لئے آپ میری مصیبتوں اور لاچاریوں کو کیونکر جان سکتے تھے! خیر، میں شکایت نہیں کرتی۔ اور کر بھی کب سکتی ہوں؟ بھلا وہ بے حیا عورت جس نے ایک شریف آدمی کی زندگی تلخ کر دی ہو شکایت کی حق دار کب ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کی وہ بدنصیب ناہید جس کی وجہ سے آپ کا دل دُکھا، اب بہت جلد اپنا مُنہ کالا کر کے اس دنیا سے جانے والی ہے۔ وہ جس نے آپ کی زندگی کو تلخ بنایا، اب مرجھا گئی ہے اب وہ خزاں کے اس پھول کے مانند ہے جس کا وجود چمن کے لئے بار ہو۔ وہ ہوا کے اس جھونکے کی منتظر ہے جو اُسے شاخ سے گرا کر مٹی میں ملا دیگا۔ اس شمع کی طرح ہے جو کسی ناشاد کے سر بالیں جھلملا رہی ہو میں تپ دق میں مبتلا، بسترِ مرگ پر ہوں۔ اور لبِ گور۔ جتنی تکلیفیں میں نے آپ کو پہونچائی ہیں انشاء اللہ اُتنی ہی تکالیف کے بعد میرا خاتمہ ہوگا۔ خدا شاہد ہے کہ مرنے کا مجھے رنج نہیں۔ ہاں اس کا افسوس ضرور ہے کہ آپ کا میں نے دل دکھایا۔ مگر میں نے آپ کو پہلے خبردار کر دیا تھا۔ کہ چمکتی ریت پر موجِ آب کا دھوکا نہ کھایئے۔ لیکن میں کیا کروں۔ آپ نے ساز کے اُس ٹوٹے ہوئے تار کو چھیڑا جس میں نغمہ مفقود تھا — خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ میں اب

اس کے لئے پشیمان بھی نہیں ہوں۔ البتہ مرنے سے پہلے آپ سے ایک التجا کرتی ہوں۔ آپ کو قسم ہے اسے ضرور پورا کیجئے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ مجھے صدق دل سے معاف کر دیں۔ نیز میری تصویر کو جلا ڈالیں اور بس۔ خدا حافظ

نوٹ :۔ س۔ س کا فرضی نام اور ناہید کا اصلی نام بدل دیا گیا ہے۔ باقی اشخاص و مقامات کے نام اصلی ہیں۔

سچّی کہانی

مچھلی کا شکار

درمیان میں ایک خوبصورت جھیل، دو ڈھائی میل کے دور میں پھیلی ہوئی جھیل کے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں، سبز جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر کوٹھیاں، بنگلے، جھونپڑیاں، اور سیڑھیوں کی طرح چڑھتے اُترتے ہوئے نیلے نیلے لمبے لمبے کھیت، گھروں میں کڑوے تیل کے چراغ۔ یہ ہے بھیم تال۔

گھوڑے کی سواری کشتی میں جھیل کی سیر اور مچھلی کا شکار، یہ ہیں یہاں کی تفریحات چند انگریز اور دو چار ہندوستانی صبح سے شام تک مچھلی کا شکار کھیلتے نظر آتے ہیں یہاں کی مچھلیاں بڑی سیانی ہیں جھیل کے نتھرے ہوئے پانی میں غول کے غول اِدھر سے اُدھر تیرتی پھرتی ہیں۔ مگر چارے پر منہ نہیں ڈالتیں۔ سوسائٹی گرلس کی طرح عیارہ و چالاک۔ غضب کی فلرٹ (FLIRT) کھیلتی کھیلتی کنارے

تک آئیں۔ سر اُبھارا، شکاری کے دل کی حرکت کو تیز کیا اور غائب۔

کل سرِ شام میں، بیگم شادانی اور ہمارے دونوں بچے (نشاط ۴½ سال۔ عامر ۲½ سال)، سیر کو نکلے جھیل کے کنارے پہنچے تو دیکھا مسٹر عبدالصمد خاں، پوسٹ ماسٹر بھیم تال، بنچی سنبھالے اپنی کشتی میں بیٹھنے ہی والے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اُنہوں نے پکارا۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب! آج آپ کو کشتی کی سیر اور مچھلی کا شکار کرائیں۔"

میں نے کہا "حضرت! یہ مچھلیاں ہمارے بس کی نہیں۔ کتنے اناڑی اور کتنے استاد دن بھر ان کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں اور شام کو خالی ہاتھ گھر جاتے ہیں۔ اب ایسا تجربہ کون کرے۔"

انہوں نے کہا۔ "آپ آیئے تو سہی۔ آج ہمارا کمال بھی دیکھئے، بیگم صاحبہ کے ہاتھ سے مچھلی نہ پکڑوا دی تو بات ہی کیا۔"

میں نے کہا "اچھی بات ہے۔ مچھلی تو خیر کیا پھنسے گی مگر آپ کی "شکست" سے ذرا تفریح ہو جائے گی۔"

غرض ہم لوگ کشتی میں بیٹھ گئے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کنارے پر کھڑے تھے۔ اُنہیں جھیل جو سوجھی تو اچانک کشتی کو پانی میں دھکا دیدیا اور قبل اس کے کہ ہم خبردار ہوں کشتی پانچ چھ گز جھیل کے اندر ——

بیگم گھبرا گئیں، میں بھی کچھ ٹپٹایا۔ نشاط "ہائے امی" کہہ کے بیگم کو چمٹ گئی

عامر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔

"گھبرایئے نہیں کشتی کے کرتب لکیر میں ابھی آیا" اور منہ پھیر کر روانہ۔ یا اللہ اب کیا کریں کشتی ہے کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ چپو چلانا۔ نہ مجھے آئے نہ بیگم کو۔ بیگم نے کہا۔

"اسے ہے اب کیا ہوگا"

میں نے کہا "ہوگا کیا۔ دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا" یہ کہا اور چپو سنبھالا۔ دو چار اُلٹے سیدھے ہاتھ مارے تو پتا چل گیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ایک دو چکر کھا کر کشتی کنارے آ لگی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بھی آ پہنچے۔ ایک ہاتھ میں کشتی کے کڑے جن میں پھنسا کر چپو چلائے جاتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں تام چینی کی دو رکابیاں ایک دوسری پر ڈھکی ہوئی۔ سامنے سے ہمارے دوست چودھری ابوالفضل صاحب صدیقی، اہرام کے مصنف بھی آتے دکھائی دیئے۔ ہم نے ایک منٹ توقف کیا۔ وہ اور پوسٹ ماسٹر صاحب دونوں کشتی میں سوار ہو گئے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے چپو سنبھالے بیگم نے بھی کشتی چل پڑی۔ اب ہم بیچ جھیل میں تھے۔ ابوالفضل صاحب بھی کشتی چلانا نہیں جانتے تھے۔ بولے "پوسٹ ماسٹر صاحب لایئے کشتی میں چلاؤں" اُنھوں نے کہا "آپ کے ہاتھ تھک جائیں گے۔" ابوالفضل صاحب بھلا اتنا بڑا طعنہ کیسے سنتے۔ کہا:

"خوب، حضرت میں شکاری ہوں۔ دن دن بھر اور رات رات بھر سارھے

چار سیر کی بندوق لے کر بیس بیس میل شکار کے پیچھے دوڑتا ہوں ۔۔۔ گرمی سردی سے بے خبر، تھکن سے ناواقف، کہیئے تو ساری رات چپو چلاؤں۔"

غرض دونوں نے اپنی جگہیں بدلیں۔ ابو الفضل صاحب نے چپو لئے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے بنچھی۔ اب ہم دوسرے کنارے کی طرف چلے۔ ابو الفضل صاحب نے ایسے اوندھے سیدھے زور زور کے ہاتھ چلائے کہ پانی اچھل اچھل کر کشتی میں آنے لگا۔ اور ناؤ ڈوبنے لگی۔ بچے چلائے "امی بھیگے۔ امی بھیگے۔ پاپا بھیگے۔"

بیگم بولیں: "اے ہے میرے بچے بھیگ رہے ہیں کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے ان کو۔ عامر گھس جاؤ پاپا کی گود میں۔ نشاط چھپ جاؤ پاپا کی بغل میں۔"

کنارہ قریب آگیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے ڈور پانی میں پھینکی۔ بنچھی بیگم کے ہاتھ میں دی اور کہا "ڈور کو انگوٹھے کے سہارے بنچھی سے ملائے رکھئے۔ ادھر سے کھینچ ہو تو پہلے ایک ہلکا سا جھٹکا دیجئے۔ پھر ڈھیل دے دیجئے۔ بس مچھلی آپ کی۔ مگر بنچھی کا سرا پانی کو نہ چھوئے۔ کشتی کے ساتھ متوازی رکھئے۔" رکابیاں انہوں نے مجھے دیں۔ اس میں تلی ہوئی مچھلی اور آلو۔ ایک ایک ٹکڑا مچھلی کا اور کئی ٹکڑے آلو کے ہر ایک کے حصے میں آئے۔ مرچیں غضب کی تھیں۔ بیگم سی سی کرنے لگیں۔ بچے بلبلا اٹھے۔ نشاط جو روئی تو بیگم ادھر متوجہ ہوئیں۔ بنچھی پانی میں جھک گئی۔ ابو الفضل صاحب نے چپکے سے کہا۔

ڈاکٹر صاحب، کشتی چلانا اتنا سہل نہیں جتنا شروع میں معلوم ہوا تھا۔" ہیں

نے کہا: "حضرت اب پتا چلا"

پوسٹ ماسٹر صاحب نے ہماری باتیں سُن لیں۔ بولے:

"نواب صاحب، رات کو شانوں پر گرم تیل کی مالش کرانی ہوگی"

ابوالفضل صاحب پھر تن گئے۔ کہا:

"حضرت یہ فولادی ہاتھ ہیں۔ بندوق چلانے والے قلم گھسنے والے نہیں"

اتنے میں بیگم بولیں!

"اے ہے یہ کیا ہوا۔ اے لو ساری ڈوری کھلی جا رہی ہے۔ لے ہے بنچی کوئی کھینچ رہا ہے اُدھر سے"

پوسٹ ماسٹر صاحب نے کہا: "گھبرائیے نہیں بیگم صاحبہ مچھلی ہے۔ ڈھیل دیجیے ڈھیل دیجیے۔ اور دیجیے۔ اور دیجیے۔ اسی طرح۔ ہاں اسی طرح۔ بہت ٹھیک۔ بنچی کو سنبھالے ہوئے۔ سرا ذرا اوپر کو اٹھائے ہوئے"

بیگم نے کہا: "اٹھاؤں کیسے۔ وہ تو بہت بھاری ہو گئی"

کشتی رُک گئی۔ بنچی پوسٹ ماسٹر صاحب نے لی۔ کھینچ کر ذرا اندازہ کیا۔ کہا: "بیگم صاحبہ آپ ہیں خوش نصیب۔ بڑا زبردست مہاشیر[1] ہے۔ واللہ کمال کر دیا آپ نے"

بنچی پھر بیگم کے ہاتھ میں دیدی۔ مہاشیر کا نام سن کر ہم سب خوش ہوئے۔ ابوالفضل

---

[1] مہاشیر غالباً ماہی شیر کی خرابی ہے بھیم تال کی جھیل میں اس قسم کی مچھلی بکثرت ہے۔ اس کا گوشت نہایت لذیذ ہوتا ہے۔

صاحب جو مہاشیر کو دیکھنے کے لئے پلٹے تھا ایک چپو ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں جا گرا۔ میں نے جلدی سے جھک کر اُسے اٹھانا چاہا تو رکابی جھیل میں۔ وزن ایک پہلو کو زیادہ ہو گیا۔ توازن بگڑا۔ کشتی ڈگمگائی۔ بچے چلائے۔ بیگم گھبرائیں۔ مچھلی پھر دور کو لے کر چلی بیگم نے کہا "اے ہے وہ پھر چلی۔ روکو۔ اُسے روکو۔ وہ بھاگی جا رہی ہے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب لیجئے بنجھی۔"

در اصل ابوالفضل صاحب کی غلطی سے کشتی آگے بڑھ گئی تھی۔ مچھلی نے زور نہیں کیا تھا۔ کشتی پھر پیچھے کو ہٹائی گئی۔ بیگم نے بنجھی مجھے دی۔ میں نے آہستہ آہستہ چرخی گھما کر ڈور لپیٹی۔ کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی بہت بھاری معلوم ہوئی۔

میں نے کہا "پوسٹ ماسٹر صاحب مچھلی تو واقعی بہت بڑی معلوم ہوتی ہے۔"

انھوں نے کہا "پانچ چھ پونڈ سے کم نہ ہو گی۔ بالکل اتفاق ہے۔ اتنی بڑی مچھلی آج تک اس جھیل میں دیکھی نہیں گئی۔"

بیگم بہت خوش ہوئیں۔ اب ہم کشتی اپنے کنارے کی طرف لے چلے میں نے بنجھی پھر بیگم کو دیدی۔

پوسٹ ماسٹر صاحب نے کہا "بیگم صاحبہ یہ مچھلی پکے گی کیسی؟ مصالحہ کی یا فقط تلی ہوئی؟"

بیگم نے کہا "مجھے تو فرائیڈ (تلی ہوئی) پسند ہے۔"

اور آپ کو ڈاکٹر صاحب؟" پوسٹ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

میں نے کہا " بماری نہ پوچھئے صاحب! دیسی دستر خوان ہو تو مصالحے کی۔ اور میز کرسی والا انداز ہو تو فرائیڈ۔ اور یوں پھر جیسی بھی مل جائے۔ مگر کانٹا اس میں نہ ہو۔ یہ دیدہ ریزی ہم سے نہیں ہوتی کہ بیٹھ کر باریک باریک کانٹے اس میں سے چنیں اور رات کو مچھلی کھانا تو پل صراط پر سے گزرنا ہے۔"

" اچھا پوسٹ ماسٹر صاحب بعض لوگ کہتے ہیں کہ مچھلی تیل میں تلی ہوئی خوب ہوتی ہے گھی میں اچھی نہیں ہوتی۔ آپ کو کیسی پسند ہے۔" بیگم نے پوچھا۔

" جی، مجھے تو تیل میں تلی ہوئی پسند ہے۔" پوسٹ ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔

" اور آپ کو ابوالفضل صاحب؟" بیگم نے دریافت کیا۔

" مجھے بھی تیل میں تلی ہوئی پسند ہے۔ بھابی۔"

" اور ڈاکٹر صاحب آپ کو" پوسٹ ماسٹر صاحب نے سوال کیا۔

" مجھے تو . . . . . مجھے تو مکھن میں تلی ہوئی اچھی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

" جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ بیگم نے مسکرا کر کہا۔" یہ میری وجہ سے کہہ رہے ہیں آپ بات یہ ہے پوسٹ ماسٹر صاحب کہ میں مکھن میں تلی ہوئی پسند کرتی ہوں۔"

" تو پھر بھلا آپ کی پسند کو میں کیونکر پسند نہ کروں۔" میں نے کہا۔

" واہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، ہر ایک کی پسند الگ ہوتی ہے۔" بیگم نے جواب دیا۔

" بھابی، تو پھر دو جگہ پکانی پڑے گی یہ مچھلی۔ تیل کی الگ اور مکھن کی الگ" ابوالفضل صاحب نے کہا۔

"نہیں میں تیل کی بھی کھالیتی ہوں"۔

اب ذرا اندھیرا ہو گیا تھا۔ شاید آسمان کے چراغ میں ابھی تک تیل نہیں پڑا تھا۔ روشنی دھندلی دھندلی تھی۔ ابوالفضل صاحب نے کہا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب اب آپ چپو لیجیے"۔

"بس نواب صاحب ہو چکی بیس میل کی دوڑ۔ تھک گئے ابھی سے"۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے طنزاً کہا۔

"نہیں۔ تھکا نہیں۔ مگر یہ آپ کے کرٹے کچھ ایسے بے تکے اور ڈھیلے ہیں کہ چپو ان میں ٹھہرتے ہی نہیں۔ نکل نکل جاتے ہیں"۔

پوسٹ ماسٹر صاحب نے ابوالفضل صاحب سے چپو لے لئے۔ اور جگہ بدل لی۔ دو چار ہاتھ قرینے سے لگے تو کشتی ذرا تیزی سے چلی۔ ڈور جو کھنچی تو بنچھی کو جھٹکا لگا۔ بیگم نے یکایک چلا کر کہا۔

"اے ہے یہ کیا"؟

میں نے پوچھا کیا ہوا۔ کہا جھٹکا جو لگا تو بنچھی اوپر کو اٹھ گئی۔ ڈور تنی تو مچھلی تھوڑی سی پانی سے نکل آئی۔ مگر یہ کیسی مچھلی ہے۔ کم بخت ایک دم کالی۔ پتلی سی ٹیڑھی ٹیڑھی"۔

اچھا ذرا میں تو دیکھوں"۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے تعجب سے کہا۔

بیگم نے بنچھی لے کر ذرا مچھلی کو ابھارا۔ ہم سب نے دیکھا۔ کالی کالی۔ پتلی پتلی، سانپ کی طرح بل کھائی ہوئی کوئی چیز تھی۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے پھر پانی میں چھوڑ دیا۔ اور

بچھی بیگم کو دیتے ہوئے بولے۔

"بیگم صاحبہ یہ بام ہے' مہاشیر نہیں۔"

"بام کیا پوسٹ ماسٹر صاحب؟" بیگم نے پوچھا۔

وہ بولے: "یہ بھی مچھلی کی ایک قسم ہے۔ مگر بام تو اس جھیل میں ہے نہیں۔ یہ کہاں سے آئی۔ اور پھر اتنی بڑی۔ بہت لمبی معلوم ہوتی ہے۔"

"تو پوسٹ ماسٹر صاحب ہمارا استعفا۔ بندہ تو بام کھاتا نہیں۔" ابوالفضل صاحب نے کہا۔

"بام تو میں نے بھی دیکھی ہے مگر پوسٹ ماسٹر صاحب یہ تو کچھ عجیب قسم کی بام ہے۔" میں نے ذرا متعجب ہو کر کہا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب یہ ہے تو کچھ عجیب ہی قسم کی۔ اور پھر لمبی بھی بہت معلوم ہوتی ہے۔" پوسٹ ماسٹر صاحب نے جواب دیا۔

"بہت زمانہ گزرا" میں نے کہا "ہمارا لڑکپن تھا۔ ایک دفعہ مچھلی کے شکار کو گئے تو ایک صاحب کے کانٹے میں ایک پنیر سانپ پھنس گیا تھا۔"

میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بیگم نے گھبرا کر کہا "ہے ہے! یہ بھی کہیں سانپ ہی نہ ہو۔ لیجئے پوسٹ ماسٹر صاحب اپنی بچھی سنبھالئے۔ اچھا شکار کھلایا آپنے" یہ کہہ کر بچھی پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرف بڑھا دی۔

"آپ ڈریئے نہیں بیگم صاحبہ۔ سانپ بھی ہوگا تو کیا کر لے گا۔ پانی کے سانپ

یوں بھی بے ضرر ہوتے ہیں۔"

"نہیں صاحب سب بے ضرر نہیں ہوتے۔ پانی کے سانپ بھی بعض بعض بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔ ہماری بھینس کے کاٹ کھایا تھا۔ برسات کے گڈے کی طرح بہ گئی" ابوالفضل صاحب نے کہا۔

بیگم اور بھی گھبرا گئیں۔ میں بھی کچھ متردد ہوا۔ سانپ کا نام بار بار سن کر عامر نے کہا۔

"چھانپ امی چھانپ"

پوسٹ ماسٹر صاحب نے پھر بنجھی کو اوپر کو اٹھایا۔ اس مرتبہ کوئی فٹ سوا فٹ وہ کالی کالی چیز پانی کے باہر نکل آئی۔

"اوئی" بیگم زور سے چلائیں۔

"قطعی سانپ ہے" پوسٹ ماسٹر صاحب نے کہا۔ اور فوراً اُسے پانی میں گرا دیا۔

اب تو ہم سب کو وحشت ہونے لگی۔

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ واہ بیگم خوب شکار پھانسا۔"

بیگم نے کہا "واہ، لو بھلا میرا اس میں کیا قصور۔ وہ کم بختی مارا کاہے کو اس میں آ پھنسا۔"

بیگم کشتی کے ایک سرے پر بیٹھی تھیں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نے اُن سے کہا۔ "بنجھی آپ لیجئے بیگم صاحبہ۔ بچوں سے دور رکھنا چاہئے۔ خدانخواستہ اچھل کر اِدھر آ پڑے تو اور مشکل ہو۔"

"نا صاحب" بیگم نے کہا۔ "آپ ہی ادھر آجائیے"۔

ابوالفضل صاحب نے اُن سے جگہ بدلی کشتی پھر ڈگمگ ہوئی۔ بیگم نے کہا۔ "الٰہی خیر۔ نشاط چلائی"۔ "آئے امی کشتی الٹی"۔ عامر نے چیخ ماری۔ بیگم نے دونوں بچوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ اور آہستہ آہستہ خدا جانے کیا پڑھنے لگیں۔

اب چاند کی روشنی کچھ تیز ہو چکی تھی۔ کانٹے میں پھنسا ہوا کالا سانپ پانی کی سطح پر لہرا رہا تھا۔ چار فیٹ سے کم اس کی لمبائی نہ ہو گی۔ بیگم اُسے دیکھ کر سہم گئیں اور گھبرا کر کہا۔

"ابوالفضل صاحب اسے پانی میں ڈبوئے رکھئے۔ اوپر مت کھینچئے"۔

"کیسے ڈبوؤں بھابی وہ تو تیر رہا ہے"۔

"کشتی ذرا تیز چلائیے پوسٹ ماسٹر صاحب"۔ بیگم نے کہا۔

"آپ گھبرائیے نہیں بیگم صاحبہ" پوسٹ ماسٹر صاحب نے جواب دیا اور کشتی تیز کر دی۔ ڈور کو جھٹکا لگا۔ سانپ تڑپا اور اچھل کر ابوالفضل صاحب کے قریب ہی آکر گرا۔

"ارے موذی مار ڈالا" ابوالفضل صاحب بے اختیار چلّا اُٹھے۔ اور بنچھی آدھی سے زیادہ پانی میں ڈبو دی۔

"ہے ہے" بیگم نے چیخ ماری۔

"الٰہی خیر" میں نے کہا۔ دونوں بچے سہم کر ماں سے چمٹ گئے۔ گھبراہٹ میں

پوسٹ ماسٹر صاحب کا ایک ہاتھ بے قاعدہ جو پڑا تو چھوکرڑے سے باہر اور کڑا اچھل کر پانی میں۔ لاحول ولا قوۃ۔ کنارہ ابھی کئی گز دور تھا۔ شکار کیا ہوا اچھی خاصی مصیبت ہو گئی مشکل سے کشتی گھاٹ پر لگی۔ سب سے پہلے ابوالفضل صاحب کشتی سے کودے۔ کودے تو پانی میں۔ جوتوں میں پانی بھر گیا۔ پتلون گھٹنوں تک شرابور۔ خیر ہوئی کہ گرے نہیں۔ کشتی کھینچ کر خشکی سے ملائی گئی۔ پھر میں اترا۔ بچوں کو اتارا۔ بیگم کو اتارا۔ سب کے بعد پوسٹ ماسٹر صاحب اُترے۔ بنجی کو سنبھالے، اپنے خوفناک شکار کو ڈور کے سہارے پانی میں کھینچتے ہوئے ہم لوگوں سے کچھ دور جا کر ٹھہرے۔

سانپ سانپ کی آوازیں لوگوں نے کنارے پر سن لی تھیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہر ایک پوچھتا تھا "سانپ کیسے پھنسا" بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ کانٹا منہ میں لیا اور پھنس گیا۔ اب سب منتظر تھے کہ سانپ پانی سے نکالا جائے تو دیکھیں کہ کیسا ہے اور کتنا بڑا ہے۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کھینچکر اُسے پانی سے باہر نکالیں۔ آخر ایک دفعہ جی کڑا کر کے جھٹکا جو دیا تو سٹاک سے سانپ کنارے پر۔ لوگ گھبرا کر بھاگے۔ کوئی پھسلا، کوئی گرا۔ ایک صاحب پانی میں لڑھک گئے۔ مشکل سے اُنہیں نکالا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب بھی بنجی چھوڑ دور جا کھڑے ہوئے۔ سانپ کے پاس جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ یہ موٹا کالا سانپ چار ساڑھے چار فیٹ لمبا۔ بل کھایا ہوا بے حس و حرکت کنارے پر پڑا تھا۔ ایک دو شریر لڑکوں نے پتھر اٹھا کر مارے مگر سانپ نے مطلق جنبش نہ کی۔ ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید مر گیا۔ کسی نے کہا کوبرا ہے

کسی نے کہا دھامن ہے۔ غرض اسی طرح چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ایک بڈھا پہاڑی آیا۔ اُس نے کہا ہٹئے ذرا میں تو دیکھوں کیسا کالا ناگ ہے۔ پانی میں کالا ناگ آج تک تو سنا نہیں۔ اُس نے پنجی اٹھا کر ڈور کو حرکت دی۔ سانپ زمین سے بلند ہوا۔ لوگ شور کرتے ہوئے بھاگے۔ بڈھا پہاڑی بولا "واہ جی واہ۔ خوب کالا ناگ پھانسا۔ یہ سانپ کدھر سے ہے۔ اجی بابو جی لکڑی ہے۔ پیڑ کی سوکھی ہوئی ٹہنی ہے۔ پانی میں پڑے پڑے کالی ہو گئی ہے۔"

ہم سب حیران رہ گئے۔ پاس جا کر دیکھا تو واقعی لکڑی سوکھی۔ کالی بل کھائی ہوئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ مہاشیر سے یام۔ بام سے کوبرا۔ کوبرا سے دھامن۔ دھامن سے فقط سوکھی لکڑی۔ لوگوں نے خوب قہقہے لگائے۔ خوب پھبتیاں کہیں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب اپنی خفت مٹانے کو بولے "واہ بیگم صاحبہ خوب سانپ پکڑا آپ نے" بیگم نے کہا "واہ جناب واہ۔ یہ سانپ ہے۔ مہاشیر ہے مہاشیر، اب جلدی اسے گھر لے جائیے اور تیل میں تلوائیے۔ بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ آج کی سیر کا اور شکار کا اور آپ کی زحمت کا بہت بہت شکریہ عمر بھر یاد رہے گا۔ یہ مہاشیر کا شکار۔ واقعی آپ کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

پوسٹ ماسٹر صاحب جھینپی جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے رخصت ہوئے۔

سچّی کہانی

نیا ادب زندہ باد

(نوٹ:۔ بعض اشخاص اور مقامات وغیرہ کے نام فرضی ہیں)

پچھلے سال ایک ضرورت سے مجھے رانچی جانا پڑا۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں مسٹر ریاض احمد، رانچی کے ہر دل عزیز وکیل۔ انہیں کے یہاں قیام کیا۔ خدا جانے کیا سبب ہے ہمیشہ سے مجھے دیوانوں کے ساتھ ایک خاص دل چسپی ہے۔ اِس بنا پر آپ کا جی چاہے تو مجھے بھی دیوانہ سمجھ لیجئے۔

ایک دن میں نے ریاض صاحب سے کہا کہ بھیّا آسانی سے ممکن ہو تو یہاں کے دماغی ہسپتال (Mental Hospital) (یا بالفاظ دیگر پاگل خانہ) کی سیر کرائیے۔ انہوں نے کہا "اچھا پرسوں چلیں گے۔ ہمارا بھی ایک بدنصیب دوست وہاں ہے۔ تیسرے دن ہم لوگ وہاں گئے۔ ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ

ڈاکٹر اسٹرلنگ سے ریاض صاحب کی خاص دوستی تھی۔ انہوں نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ طرح طرح کے پاگل دیکھے۔ مرد بھی۔ عورتیں بھی۔ بوڑھے بھی۔ جوان بھی۔ کچھ کپڑے پہنے ہوئے، کچھ نیم برہنہ، کچھ بالکل ننگے۔ ان کی طرح طرح کی باتیں بھی سنیں۔ اکثر بے سروپا، کچھ سنجیدہ، کچھ نہایت دانشمندانہ۔ ایک وارڈ کے سامنے سے جب ہم گذر رہے تھے تو ریاض صاحب نے کہا۔ "چلئے اب آپ کو اپنے دوست رشید سے ملائیں" رشید کا کمرہ قریب ہی تھا ہم وہاں پہنچے۔ آہ کتنا خوبصورت جوان۔ خوبصورت بھی، خوش اندام بھی۔ آنکھیں بلا کی جاذب، مگر چہرہ حسرت واندوہ کا مرقع۔ بکھرے ہوئے بال، بڑھا ہوا خط۔ پھٹے ہوئے کپڑے، بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ اپنے خیالات میں غرق، دنیا ومافیہا سے بے خبر، ہم پاس جاکر کھڑے ہوئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ریاض صاحب نے نام لے کر پکارا تو چونکا۔ پھر کھڑا ہوگیا اور چلا کر کہا:۔

"وہ مارا! قسم خدا کی وہ مارا! ریاض بھائی میں کامیاب ہوگیا۔ واللہ! کامیاب ہوگیا۔ آگئی مچھلی جال میں بس پھنسی ہی سمجھو۔ اب کہاں جائے گی بچ کر۔ فرائڈ زندہ باد نیا ادب زندہ باد۔ میں نے اسے خط لکھا ہے۔ یہیں آئے گی دوڑتی ہوئی دیکھ لینا تم۔" پھر خط اٹھا کر ریاض صاحب کو دکھایا۔ میں نے بھی دیکھا۔ چند بے ربط اوٹ پٹانگ ٹوٹے پھوٹے جملے لکھے تھے۔ ریاض صاحب نے کہا۔ ماشاء اللہ بہت خوب لکھا ہے پھر خدا جانے اچانک کیا اس کے جی میں آئی کہ دوات اٹھا کر دیوار سے دے

ماری۔ خط ریاض صاحب کے ہاتھ سے چھین کر پرزے پرزے کر ڈالا۔ ریاض صاحب نے آہستہ سے کہا۔ اس کا جنون تیز ہو رہا ہے۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ہم چلے آئے۔

راستے میں میں نے ریاض صاحب سے کہا "قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے ہائے ایسا خوبرو جوان اور اس طرح برباد" ریاض صاحب نے اندوہناک لہجہ میں کہا "ہاں بھائی، قدرت کے بھید کون جانے" میں نے پوچھا آخر یہ دیوانہ ہوا کیونکر؟ انہوں نے کہا۔ یہ بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔ گھر چل کر اطمینان سے سناؤں گا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ میں نے کہا ہاں ریاض صاحب وہ رشید کا قصہ تو سنائیے۔ رشید کا نام سن کر ریاض صاحب کا چہرہ افسردہ ہو گیا وہ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے اور اس طرح کہنا شروع کیا۔

"جس وقت ابا کی بدلی الہ آباد کی ہوتی انہوں نے ہم سب لوگوں کو بھی وہیں بلا لیا اور مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہیں رشید سے ملاقات ہوئی۔ میں اور وہ چھ برس ہم سبق رہے۔ دو برس اسکول میں، چار برس کالج اور یونیورسٹی میں۔ ساتھی تو ہمارے اور بھی بہت تھے۔ مگر رشید جیسے ذہین، شوخ، طرار اور ہنس مکھ انسان میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ جیسی اچھی صورت، ویسی ہی اچھی سیرت۔ ہم دونوں کے مذاق بالکل جداگانہ تھے۔ وہ شعر و سخن کا عاشق۔ ادبیات کا پرستار۔ اور میں سائنس کا طالب علم۔ پھر بھی خدا جانے کیوں، ہم دونوں میں بے حد خلوص ہو گیا تھا۔

رشید ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا انہوں نے اپنی یادگار چھوڑے۔ بڑی بہن سعیدہ رشید سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ ماں کے مرنے کے بعد انہیں نے رشید کو پالا۔ مگر چند سال بعد لاہور کے خان بہادر میاں عبدالحکیم سے ان کی شادی ہو گئی۔ اور وہ اپنے گھر چلی گئیں۔ خدا کی شان، برسوں اولاد کے لئے ترستی رہیں لیکن ان کی گود نہ بھری۔ آخر بڑی منتوں، مرادوں کے بعد شادی کے پانچویں سال خدا نے انہیں ایک بیٹی عنایت کی۔ مگر اس ننھی گڑیا نے ابھی مسکرانا بھی نہ سیکھا تھا کہ وہ خود چل بسیں۔ میاں صاحب کے لئے ننھی بچی کا سنبھالنا مصیبت ہو گیا۔ مرحومہ کی وفات کے دو مہینے بعد ہی انہوں نے رشید کی دوسری بہن راشدہ سے شادی کا پیغام دے دیا۔

میاں صاحب عمر میں راشدہ سے بہت بڑے تھے۔ راشدہ اس وقت مشکل سے انیس سال کی تھی اور میاں صاحب کا سن چالیس کے پار۔ اس بنا پر رشید کے والد اس رشتے پر راضی نہ ہوئے۔ میاں صاحب کو اپنی دولت اور پوزیشن پر بڑا ناز تھا اس انکار کو اپنی توہین سمجھے اور زندگی بھر کے لئے ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لئے۔

رشید کی ایک خالہ بھی تھیں۔ جو لکھنؤ میں رہتی تھیں۔ وہ رشید کو بہت چاہتی تھیں اُن کی خواہش تھی کہ رشید کی شادی اُن کی لڑکی ربیعہ سے ہو جائے جس وقت میں اور رشید انٹرمیڈیٹ پاس کر کے یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ رشید کی منگنی ربیعہ

سے ہو گئی۔ اور طے یہ پایا کہ شادی اُس وقت ہو جب رشید بی۔ اے پاس کر لے۔ ربیعہ اسی سال میٹریکولیشن کا امتحان دینے والی تھی۔ ربیعہ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کی تصویر دیکھی تھی۔ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ رشید نے اُسے بارہا دیکھا تھا۔ بارہا اُس سے ملا تھا۔ وہ شروع ہی سے اُسے پسند کرتا تھا۔ اور اب اِس خیال سے مسرور تھا۔ کہ دو سال بعد ربیعہ اُس کی رفیق زندگی بن جائے گی۔

منگنی ہو جانے کے بعد خاندان کی رسم کے مطابق رشید سے ربیعہ کا پردہ ہو گیا مگر نام کا پردہ تھا۔ دونوں برابر ملتے تھے، مگر چھپ چھپ کر خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ مگر خفیہ طور پر، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید کو ربیعہ سے والہانہ محبت ہو گئی۔ مگر یہ خیال اکثر اُس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ کہ ربیعہ اُسے اتنا نہیں چاہتی تھی جتنا وہ ربیعہ کو پیار کرتا تھا۔ سال بھر گذر گیا۔ ربیعہ میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ میں داخل ہو گئی۔ اب ہم دونوں بی۔ اے کے آخری سال میں تھے۔ اتفاق سے رشید بیمار ہو گیا۔ اور کئی مہینے تک ربیعہ سے ملنے لکھنؤ نہ جا سکا۔ اِس درمیان میں ربیعہ کے خط بھی بہت کم آئے۔ ہر وقت ایک مبہم سا خوف رشید پر چھایا رہنے لگا۔ اکثر مجھ سے کہتا: "ریاض بھائی، خدا خیر کرے۔ آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ نہ جانے قدرت کو کیا منظور ہے۔" میں اُسے تسلی دیتا۔ کہ کچھ بھی نہیں محض تمہارا واہمہ ہے۔ ربیعہ تمہاری ہے۔ اور شادی میں اب دن ہی ایسے کونسے باقی ہیں۔ چھ مہینے بھی تو نہیں۔

آخر وہ ایک دن لکھنؤ گیا۔ اسی دن مجھے بھی ایک ضرورت سے وطن (پٹنہ) جانا پڑا۔ لکھنؤ سے اُس نے مجھے جو خط لکھا اُسے پڑھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔

یہ کہہ کر ریاض صاحب اُٹھے۔ اندر گئے اور خطوں کا ایک پیکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے واپس آئے۔ اس میں سے ایک خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"ریاض بھائی میں لٹ گیا۔ تباہ ہو گیا۔ قسمت نے میرے ساتھ دغا کی۔ ربیعہ نے میرے ساتھ دغا کی۔ اب وہ میری نہیں ہو سکتی۔ اُس نے مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اب اُس نے کچھ اور ہی جی میں ٹھانی ہے۔ یہاں مقامی کالج کا ایک پروفیسر ہے احمد کبیر۔ نئے ادب کا بڑا حامی ہے۔ فرضی نام سے افسانے لکھتا ہے اور بہت عریاں لکھتا ہے۔ اُس کی عریاں نگاریوں نے جوان لڑکیوں کے جذبات میں آگ لگا دی ہے۔ ربیعہ بھی اِسی جال میں پھنس گئی پہلے نادیدہ پرستار ہوئی۔ اور اب "وہ" دیوتا ہے اور یہ پجارن۔ شادی طے ہو چکی ہے خالہ اماں سے بھی اُس نے کہہ دیا ہے کہ کوئی بھی میرے معاملے میں دخل انداز ہوا تو اچھا نہ ہو گا۔ میں ہر انجام کے لئے تیار ہوں۔ کسی کی غلام نہیں کہ اپنی مرضی کے خلاف جس کے دامن سے باندھ دی جاؤں اُس کے ساتھ ہو لوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اب اُسے اُس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں اپنی حالت کیا لکھوں۔ جان کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ ہوش بجا نہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میری آدھی جان نکل چکی ہے۔ دل میں نفرت و انتقام کی ایک آگ بھڑک اُٹھی ہے۔ مستقبل کے

کے لئے میں نے اپنا طریق کار سوچ لیا ہے میں بھی وہی کروں گا جو احمد کبیر نے کیا۔ جو ربیعہ نے کیا۔ شہوانی جذبات کو ابھارنے والے، معصیت پر اکسانے والے، عریاں افسانے لکھوں گا۔ اِس طرح نوجوان لڑکیوں کو اپنی ہوس کار محبت کے جال میں پھنساؤں گا اور اپنے نفس کی تسکین کے بعد نہایت بے حسی اور اطمینان کے ساتھ انہیں رسوائی اور بربادی کے غار میں دھکیل دوں گا۔"

دو ہفتے کے بعد جب میں الہ آباد واپس آیا تو رشید سے ملاقات ہوئی۔ اب وہ پہلا سا رشید نہ تھا۔ اس کی شوخیاں افسردگی میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ مزاج میں تلخی آگئی تھی۔ احباب سے ملنا جلنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ مجھ سے بھی ملاقات ہوتی تو زیادہ تر خاموش ہی بیٹھا رہتا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ ایک دن میں نے کسی بات کے ضمن میں ربیعہ کا کچھ ذکر کیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بچھو نے اُس کے ڈنک مار دیا۔ تلملا اُٹھا اور کہا: "ریاض بھائی خدا کے لئے اُس زہریلی ناگن کا نام نہ لیجئے۔ آپ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ دیکھئے تو کیا ہوتا ہے میں نے جال بچھا دیا ہے۔ ربیعہ جیسی درجنوں چھوکریاں رشید کے التفات کی بھیک مانگیں گی۔"

رشید میں افسانہ نگاری کی بڑی صلاحیت تھی۔ شعر بھی خوب کہتا تھا۔ تقریباً دو برس سے اس کے افسانے ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع اور عام طور پر مقبول ہو رہے تھے۔ مگر اس کے افسانے نہایت پاکیزہ جذبات کے حامل ہوتے تھے۔ اور وہ ہمیشہ بلند اخلاق کرداروں کی تخلیق کرتا تھا۔ لیکن اب اُس نے اپنا رنگ بدل دیا

تھا۔ اب وہ " آفتاب " کے فرضی نام سے افسانے لکھتا تھا۔ اِس قدر عریاں، اِس قدر جذبات کو مشتعل کرنے والے کہ خدا کی پناہ۔ اس کے قلم میں زور تھا۔ بیان پر قدرت تھی۔ اِس رنگ میں بھی وہ جلد ہی نمایاں ہوگیا۔ کئی بار میں نے اُسے ٹوکا کہ رشید افسوس ہے تم پاکیزہ اخلاق کی رفعتوں سے پھسل کر معصیت کے تاریک غار میں جا گرے۔ کاش تم اس پر غور کرتے۔ اس نے کہا۔ ریاض بھائی آپ دیکھتے جایئے پستیوں کے بعد پھر بلندیاں آئیں گی۔ تاریکیوں کے بعد پھر روشنیوں کا ظہور ہوگا۔

لکھتا وہ پہلے بھی بہت تھا مگر اس انہماک اور اس کثرت سے نہیں۔ اب تو بیداری کے ۱۸ گھنٹوں میں سے تقریباً ۱۲ گھنٹے وہ افسانہ نگاری کی نذر کر دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ امتحان میں فیل ہو جائے گا مگر قدرت نے اُسے بلا کا حافظہ عنایت کیا تھا اس پر غیر معمولی ذہانت۔ پاس ہوا اور مجھ سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہوا۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد ابا جان کی صلاح ہوئی۔ کہ میں قانون پڑھوں۔ لہٰذا میں نے لا کلاس میں داخلہ کرالیا۔ رشید کا اب تمام وقت افسانہ نگاری میں صرف ہوتا تھا۔ ایک دن سرِ شام وہ میرے یہاں آیا۔ ربعیہ والے حادثے کے بعد میں نے اُسے اتنا شگفتہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کئی خط اُس کے ہاتھ میں تھے۔ سامنا ہوتے ہی چلا کر کہا۔

" وہ مارا! قسم خدا کی وہ مارا! ریاض بھائی میں کامیاب ہوگیا۔ واللہ کامیاب ہوگیا۔ آ گئی مچھلی جال میں بس پھنسی ہی سمجھو۔ اب کہاں جائے گی بچ کر۔ فرائڈ زندہ باد۔

نیا ادب زندہ باد۔"

میں نے کہا کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی۔ کیا ماجرا ہے کس بات میں کامیاب ہو گئے۔ کہیں ملازمت کی درخواست دی تھی؟ انٹرویو کے لئے بلائے گئے ہو؟ آخر......

"لاحول ولا قوۃ" وہ میری بات کاٹ کر بولا: "ریاض بھائی آپ بھی کس قدر غیر شاعرانہ باتیں کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے چھوٹا سا نیلے رنگ کا ایک خوبصورت لفافہ میری طرف بڑھایا اور کہا اسے پڑھئے۔ میں نے کہا تم ہی سُناؤ۔ میری عینک اندر ہے۔ اُس نے سُنانا شروع کیا:۔

ریاض صاحب نے پھر اُسی پیکٹ میں سے ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگے۔

"مسٹر آفتاب، تسلیم، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ افسانہ نگار ہیں یا جادوگر۔ آپ مصور ہیں یا خالق؟ تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں یا مجسموں میں جان ڈالتے ہیں؟" "شہاب کے تازہ پرچے میں آپ کا افسانہ "بھولی بسری باتیں" پڑھا۔ خدا شاہد ہے۔ پڑھ کر جھوم جھوم گئی۔ کیسی کیسی زندہ تصویریں آپ نے اس میں کھینچی ہیں۔ کس قدر حسین ہے یہ ٹکڑا:۔

"سہانی شام تھی۔ اونچی نیچی پہاڑیاں اُن کے چاروں طرف دور تک پھیلی ہوئی تھیں وہ بلندی سے ایک نشیب کی طرف اُتر رہے تھے۔ اُن کے ساتھی پیچھے رہ گئے تھے پگ ڈنڈی تنگ تھی۔ اور وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ شہلا پیچھے پیچھے تھی سہارا

لینے کے لئے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ عارف کے کاندھوں پر رکھ دیئے تھے۔ گردن کے بالکل متصل۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے اور اس پُرکیف منظر سے لطف اٹھاتے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اب وہ ایک پیچ دار راستے سے اُتر رہے تھے۔ احتیاط سے چلنا ضروری تھا۔ عارف ایک لمحہ کے لئے ٹھہرا۔ یکایک اُس نے شہلا کی گداز بانہوں کی گرمی اپنی گردن کے گرد محسوس کی۔ وہ سہانی شام، وہ نرم نرم ٹھنڈی ہوا، وہ خاموش پہاڑیاں، وہ پُرسکون فضا، وہ چشمے کا دھیما دھیما راگ، وہ دلنواز منظر، وہ آزاد تنہائی۔ ایک بے خودی سی اس کے حواس پر چھا گئی۔ بے اختیار ہو کر اُس نے شہلا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ اب اُن کے لب آبِ حیات پی رہے تھے۔ شہلا کی آنکھیں بند تھیں، عارف کے بازو پر اس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی تھی۔ اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ پھر وہ سنبھلے۔ ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ شہلا نے ایک سنگریزہ اٹھایا اور دوسرے سنگریزہ سے اُس پر عارف کا نام لکھ دیا۔ شہلا کو خبر نہیں لیکن محبت کی یہ یادگار آج بھی عارف کے پاس محفوظ ہے۔"

میں نے اپنی کئی سہیلیوں کو آپ کا یہ افسانہ سنایا۔ سب نے یہی کہا "قیامت کی ہے ظالم نے"۔ معاف کیجئے گا میں نے دوسروں کی ایک پرائیویٹ بات آپ سے کہہ دی۔ قیامت پر قیامت یہ ہوئی کہ اتفاق سے ہماری سہیلیوں میں سے ایک کا نام ہے شہلا۔ وہ ابھی پہاڑ سے آئی ہے۔ سب نے اُسے بنانا شروع کیا کہ

سچ بتا شہلا! کون ہیں یہ عارف صاحب؟ کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ اور شہلا تھی کہ کٹی جاتی تھی۔ معاف کیجئے گا۔ میری اس بے سروپا تحریر کو۔ اس قدر لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو اس قابل تو نہیں سمجھتی کہ آپ جیسے ایک سحر طراز ادیب کے ایک شاہکار کی داد دوں۔ مگر جی نہ مانا۔ اور بے اختیار یہ سطریں قلم سے نکل گئیں۔ رسید کا انتظار کروں گی۔ کیا آپ اپنی رنگین تحریر سے شاد کام فرمائینگے ہاں اگر مضائقہ نہ ہو تو اپنا پتہ بھی عنایت کیجئے۔ رسالے کی معرفت خط بھیجنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

منتظر التفات

خاکسار ~~شہلا~~ شاہدہ

پارک ویو۔ پیلس میرٹھ

پہلے شہلا لکھا تھا۔ پھر اُسے کاٹ کر شاہدہ بنا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس لڑکی نے یہ خط لکھا ہے۔ شاید خود اسی کا نام شہلا ہے۔

خط پڑھنے کے بعد میں نے کہا۔ رشید تم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہے ہو۔ اس نے کہا۔ اچھا نصیحت بعد میں کیجئے گا۔ پہلے خط تو سن لیجئے۔ یہ کہہ کر اُس نے دوسرا خط پڑھنا شروع کیا۔

ریاض صاحب نے اُسی پیکیٹ میں سے ایک اور خط نکالا۔ اور اُسے پڑھنے لگے:۔

معرفت خان بہادر نیاز احمد خاں صاحب ڈی۔ ایس۔ پی۔

گلی قاسم جان۔ دہلی

آفتاب صاحب، تسلیم

معاف کیجئے گا۔ ایک اجنبی ہونے کے باوجود آپ سے خطاب کی جرأت کر رہی ہوں۔ ہُوا یہ کہ کل ایک ضرورت سے اسٹیشن گئی تھی۔ بک اسٹال سے یونہیں "شہاب" کا تازہ پرچہ خرید لیا۔ اس میں آپ کا افسانہ "بھولی بسری باتیں" نظر سے گذرا۔ پڑھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ جذبات نگاری اور منظر کشی میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ یوں تو سارا افسانہ سر سے پاؤں تک ایک نئی دلہن کی طرح آراستہ ہے۔ مگر اس کے بعض حصے مجھے بہت پسند آئے مثلاً:۔

"دل کو خون کر دینے والے تمہارے بے دردانہ سلوک کے بعد میں نے عہد کیا تھا کہ اب میں تمہیں کبھی خط نہ لکھوں گا۔ تم سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ آنکھیں ترسیں گی تمہیں دیکھنے کے لئے۔ میں انہیں ترسنے دوں گا۔ دل تڑپے گا تم سے ملنے کے لئے میں اُسے تڑپنے دوں گا۔ مگر آج معلوم ہُوا کہ میں نے اپنے جذبات کی گہرائی کا بالکل غلط اندازہ کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایک ساحر کی طرح میری ہستی پر چھا گئی ہو۔ میری روح میں سما گئی ہو۔ میں نے بہت ضبط کیا۔ جہاں تک ہو سکا دل پر جبر کیا۔ مگر شہلا! تیری ہی جان نواز محبت کی قسم! صبر کا پیالہ آج بھر ہی نہیں گیا۔ چھلک پڑا ہے۔ میں بالکل مجبور ہو گیا کہ اپنے دل کی ویرانیاں، اپنی آنکھوں کی تمناکیاں، اپنی روح

کی بے تابیاں تمہیں دکھاؤں اور تمہیں یاد دلاؤں "کبھی" کی وہ والہانہ سپردگی جس کے تصور ہی سے میری روح میں ایک کیف، ایک اہتزاز، ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے

نہر بہ رہی ہے۔ بانسوں کا کنج ہے۔ گھنا سایہ ہے۔ آزادی ہے۔ تنہائی ہے۔ شور و شغب کی دنیا سے دور محبت کے دو پرستار۔ نہیں۔ ایک دیوی۔ دوسرا اس کا پجاری ——— ناز و نیاز کی محفل جمی ہے۔ زبانیں خاموش ہیں۔ دل بول رہے ہیں۔ پجاری نے دیوی کے سینڈل کھولے۔ چشمے کا پانی لے کر اس کے پاؤں دھوئے۔ اپنے رومال سے خشک کئے۔ پھر انہیں اپنی آنکھوں سے لگایا۔ دیوی اپنے پرستار کی عقیدت سے مسرور ہو گئی۔ اس کے ہاتھ بڑھے۔ اور پجاری کی گردن میں حمائل ہو گئے۔ پجاری پر بے خودی چھا گئی۔ اس نے اپنے آغوش کی تمام گنجائشوں میں اپنی دیوی کو سمیٹ لیا دیوی نے اپنے ہونٹوں سے اسے پریم رس پلایا۔ اپنے دل کی دھڑکنوں سے اس کی بیتاب روح کو سکون بخشا۔ اپنے آغوش کی گرمی سے اس کی رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آہ۔ وہ بہشتی لمحے۔ وہ روح پرور ساعتیں۔ دیوی اب خود بھی سرخوشی کے عالم میں تھی۔ اس کی گردن پجاری کے بازو پر تھی۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال زمین پر لٹک رہے تھے۔ اس کی بانہیں پجاری کے گرد حلقہ کئے تھیں۔ اس کی آنکھیں آسمان کی طرف تھیں اور سر عالم بے خودی میں پیچھے کو جھک گیا تھا۔ اسی عالم خود فراموشی میں دیوی کے کان کا ایک آویزہ زمین پر گر پڑا۔ دیوی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پجاری نے اسے اٹھا لیا۔ وہ آج تک اس کے پاس محفوظ ہے۔ ان بہشتی لمحوں کی یادگار۔"

اس کامیاب افسانے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔ زیادہ نیاز۔

راقمہ، دل آرا

اس کے بعد اُس نے تیسرا لفافہ کھولا۔ اس میں خط کے ساتھ کسی رسالے کا کٹنگ بھی تھا۔ ریاض صاحب نے اپنے پیکٹ میں سے وہ خط اور کٹنگ نکالا۔ اور خط پڑھنا شروع کیا۔

گل افشاں، بیڈن روڈ۔ لاہور

۱۰ر ستمبر ۱۹۴۱ء

جناب آفتاب صاحب! معاف فرمایئے گا، میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ کل میری ایک سہیلی نے اِس مہینے کا رسالہ "آوازہ" مجھے دیا۔ اور بڑی تعریفوں کے ساتھ آپ کا افسانہ "تجربہ" پڑھنے کی سفارش کی۔ میں نے اُسے پڑھا اور میں بیان نہیں کر سکتی کہ اسے پڑھ کر مجھے کتنا رنج، کتنا صدمہ ہوا۔ خدا را بتایئے کہ سوسائٹی نے آپ کا کیا گناہ کیا ہے جو آپ اس قسم کی زہریلی تحریروں اُس کی اخلاقی فضا کو مسموم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس قسم کی عریاں اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تحریروں کو پڑھ کر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ کاش آپ سمجھتے کہ اس قسم کے افسانے لکھ لکھ کر آپ کتنے معصوم دلوں کو معصیت کے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ کتنے شریف گھروں میں رسوائی اور بدنامی کے بیج بو رہے ہیں۔ کتنی پُرسکون زندگیوں میں جذبات کا طوفان برپا کر کے اُنہیں تباہی

کی طرف لے جارہے ہیں۔ کاش قانون کا شکنجہ اتنا وسیع ہوتا کہ آپ اُس کی گرفت میں آسکتے۔ اور قدرت نے آپ کو جو صلاحیتیں دی ہیں اُنہیں اِس طرح برباد نہ کرتے۔ آپکے افسانے کا ایک ٹکڑا "آوازہ" میں سے تراش کر بھیج رہی ہوں۔ خدارا ذرا آپ اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھیئے اور دیکھیئے کہ آپ نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے

خدا حافظ۔

آپکے عتاب کی سزاوار

صبیحہ

میں نے ریاض صاحب سے کہا۔ رسالے کا وہ کٹنگ بھی تو سنایئے، دیکھیں تو اس میں کیا لکھا ہے۔ ریاض صاحب نے کہا سنئے:۔

"آہ، جاوید، میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ ہونٹ کیسے تھے؟ میں نے گلابی ہونٹ بھی دیکھے ہیں اور سرخ بھی۔ میں نے ان کی تعریفیں بھی کی ہیں۔ کبھی لعل و یاقوت سے تشبیہ دی کبھی مرجان سے۔ کبھی گلاب کی پنکھڑی سے، کبھی شراب سے، مگر سلمیٰ کے ہونٹ! اُف کیا قیامت تھے سلمیٰ کے ہونٹ۔ میری طرح سلمیٰ بھی کبھی پان نہیں کھاتی۔ مگر اُس دن خود بھی کھایا اور مجھے بھی کھلایا۔ پان کی لالی نے قہر کیا۔ گلاب کی نکھڑیوں کو دہکتے ہوئے انگارے بنا دیا۔ جاوید" ٹھنڈی آگ" تم نے سنی ہوگی۔ مگر کبھی دیکھی نہ ہوگی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے لبوں سے محسوس کی۔ جاوید کن لفظوں میں بیان کروں اُن ہونٹوں پر پان کی سُرخی کا رنگ۔ تمہیں یاد ہوگا۔ ایران میں ہم نے پہاڑی چکور دیکھا

تھا۔ اُس کی سُرخ منقار بھُولے تو نہ ہو گے بس سلمٰی کے ہونٹ بھی کچھ ایسے ہی ہو گئے تھے۔ مگر اس سُرخی میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ جیسے ہیرے کی جوت۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن میں رس بھرا ہوا ہے کہ چھوتے ہی ٹپک پڑے گا۔ بالکل پکی چیریوں کی طرح۔ وہی سُرخ رنگ، وہی میٹھا رس۔ مگر چیری کے ( ) رس میں وہ مستی کہاں۔ جو سلمٰی کے ہونٹوں کے رس میں تھی۔ امرت کے یہ ساگر بے اختیار میرے لبوں کو اپنی طرف کھینچے لیتے تھے ضبط دشوار تھا، اور جلد ہی ناممکن ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان کی حدود سے خارج ہے تصوّر کے آئینہ میں تم اُس تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ سکتے ہو یعنی ظاہری وہ باطنی کیفیت جو اس وقت میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی وہ نہ تم سمجھ سکتے ہو نہ میں سمجھا سکتا ہوں۔

تم کہہ سکتے ہو "آخر وہ ایسی کونسی نئی کیفیت تھی جو دنیا میں کبھی کسی نے محسوس نہیں کی؟ یہی نا کہ دو چاہنے والوں کے لب باہم پیوست ہو گئے تھے۔ پھر یہ تو کوئی ایسی نئی بات نہیں۔ ہر روز ایسا ہوتا ہے۔ ہر وقت ایسا ہوتا ہے۔ ہاں! تم سچ کہتے ہو جاوید! آرزومند لبوں کا آپس میں ملنا کوئی نئی بات نہیں۔ خود میرے لئے بھی یہ تجربہ نیا نہیں۔ منہ بند کلیاں بھی میں نے چُوسی ہیں۔ تازہ کھلے ہوئے پھُولوں کا رس بھی لیا ہے۔ میرے لبوں نے اُن پھُولوں کے مخملیں لمس سے بھی تسکین پائی ہے۔ جو ہنوز شاخ سے جدا نہیں ہوئے۔ اور اُن پھُولوں سے بھی جو ہار میں گوندھے جا چکے جسم میں ایک سنسنی، ایک ارتعاش، روح میں ایک بے خودی، ایک اہتزاز یہ سب کیفیتیں میں نے

محسوس کی ہیں۔ مگر جاوید، سلمیٰ کے ہونٹوں نے مجھے جس عالم میں پہنچا دیا تھا وہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ وہ کیفیت اِن تمام کیفیتوں سے بالکل جدا تھی۔ جو میں نے اپنی زندگی میں محسوس کی ہیں۔ اِسی لئے میں نے کہا تھا۔ کہ نہ تم اُسے سمجھ سکتے ہو نہ میں سمجھا سکتا ہوں۔

جس وقت سلمیٰ کا سر میرے زانوں پر اور اُس کا جسم میرے آغوش میں تھا۔ اس کے چہرے کی چمک دیدنی تھی۔ جس وقت میں نے جھک کر اپنا منہ سلمیٰ کے منہ پر رکھ دیا۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہزاروں بجلیاں میری رگوں میں دوڑ گئیں اور لاکھوں ستارے میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ ایک نیم بیہوشی کی سی کیفیت میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ سلمیٰ کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خماری کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور اُس کا خوبصورت سینہ موجوں کی طرح بار بار بلند ہوتا تھا۔ میرے سینے سے مل جانے کے لئے۔"

رسالہ کا کٹنگ ختم کرنے کے بعد ریاض صاحب نے کہا۔

"صبیحہ کا خط سُن کر میں نے رشید سے کہا۔ "دیکھا تم نے، کیسا طمانچہ لگایا اس شریف لڑکی نے تمہارے منہ پر۔ اور لکھو عریاں تجربے۔ رشید مسکرا کر بولا۔" ریاض بھائی آپ تھوڑا سا صبر کیجئے۔ یہی اخلاق کی معلمہ رشید کے انہیں بے پناہ تیروں سے گھائل ہو گی۔ اور رشید کی ایک نگاہِ لطف پر اپنا سب کچھ مٹا دینے کے لئے تیار ہو جائیگی

اب میں ساری توجہ اسی آہوئے وحشی کے رام کرنے میں صرف کر دوں گا۔" میں نے کہا رشید! اس خطرناک کھیل میں شرمساری اور ندامت کے سوا اور کچھ بھی تمہارے ہاتھ نہ آئے گا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چار مہینے گذر گئے اور اس اثنا میں اس ظالم نے خدا جانے کیا سحر کیا کہ صبیحہ نادیدہ اس پر جان دینے لگی۔ آپس میں تصویروں کا مبادلہ ہوا اُس نے طرفین کے شوق کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ صبیحہ کی تصویر میں نے بھی دیکھی تھی۔ بڑی پیاری صورت تھی۔ بس تصویر تھی۔ صیاد اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گیا۔ یوں تو وہ صبیحہ کی تحریر دل ہی پر فدا تھا لیکن تصویر دیکھنے کے بعد تو وہ اسے اپنے قلب و رُوح کی انتہائی گہرائیوں سے چاہنے لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تحفے بھی بھیجے۔ صبیحہ نے رشید کو لاہور بلایا۔ لاہور جاتے وقت وہ بے انتہا مسرور تھا۔ میں نے کہا رشید! قدرت کو تمہاری نامرادی پر ترس آگیا۔ اُس نے کہا ہاں، ریاض بھائی آپ سچ کہتے ہیں۔ آج مجھے اپنی قسمت پر ناز ہے۔ میں کہتا تھا قسمت نے میرے ساتھ دغا کی۔ مگر آج معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ میری بہتری کے لئے تھا۔ ریحہ کو نہ کھوتا تو صبیحہ کو کیونکر پاتا۔ قدرت نے ایک پھول چھین کر، میرا دامن پھولوں سے بھر دیا۔ ایک ستارہ لے کر مجھے کہکشاں کا مالک بنا دیا۔ وہ لاہور گیا۔ ایک ہوٹل میں ٹھیرا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر اس درجہ خوش ہوئے۔ گویا انہوں نے اپنے حاصل زندگی کو پالیا۔

صبیحہ اپنے باپ کی اکلوتی اور بہت ہی لاڈلی بیٹی تھی۔ دولت کی فراوانی تھی

عمر بھر ناز و نعمت کے گہواروں میں پلی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو سب کچھ بتا دیا۔ اور یہاں تک کہہ دیا کہ ابا میری زندگی اور زندگی کی کوئی مسرت اب "آفتاب" کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی"۔ باپ نے بیٹی کی خوشی کو مقدم سمجھا۔ آخر تینوں کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ گل افشاں میں "آفتاب" کی دعوت ہوئی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت فرطِ مسرت سے رشید کا کیا حال ہوا ہوگا۔ وہ تینوں ملے اور چند ہی منٹ کے بعد اُنہیں معلوم ہو گیا کہ سورج پچھم سے نکل سکتا ہے۔ پانی بلندی کی طرف بہہ سکتا ہے ہر ناممکن چیز ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر صبیحہ اور رشید قیامت تک ایک دوسرے کے رفیقِ زندگی نہیں بن سکتے۔

پوچھنے پر جس وقت رشید نے اپنا اصلی نام بتایا اور اپنے والد کا نام لیا تو صبیحہ کے والد پر ایک بجلی سی گری معلوم ہوتا تھا۔ اُنہوں نے کوئی سخت بھیانک خواب دیکھا ہے اُن کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ صبیحہ اور رشید اُن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ بس انہوں نے اتنا کہا "ہائے بدقسمت ماں کی بدقسمت بیٹی" اور دونو ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ پھر بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ رشید اور صبیحہ دونوں سخت پریشان تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معمّا ہے۔ آخر انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "رشید تم مجھے نہیں جانتے؟ خان بہادر میاں عبدالحکیم کا نام تم نے کبھی سنا ہے؟" اتنا سننا تھا کہ معلوم ہوا رشید کی روح کسی نے سلب کر لی۔ خدا جانے وہ کیوں یکایک کھڑا ہو گیا۔ ایک آہ کی اور تیورا کر گرا۔ سر ایک

کرسی سے ٹکرا کر غش ہو گیا۔ فرش پر خون ہی خون تھا۔ پھر جو ہوش آیا تو ہوش ہمیشہ کے لئے اُس سے رخصت ہو چکا تھا۔ بہت دوا دوش کی گئی مگر بے سود۔ اب کتنے دنوں سے یہاں رانچی میں ہے۔ مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ دن رات بیٹھا خط لکھا کرتا ہے کبھی کبھی میں اُسے دیکھنے جاتا ہوں۔ اُس نے میری صورت دیکھی اور چلّایا، کہ وہ مارا، قسم خدا کی وہ مارا، ریاض بھائی میں کامیاب ہو گیا! واللہ کامیاب ہو گیا۔ آ گئی مچھلی جال میں۔ ”فرائڈ زندہ باد، نیا ادب زندہ باد۔“

سچّی کہانی

شاہی انعام

وطن اور قوم کی بھلائی چاہنے والوں کی کوششوں سے ہندوستانیوں میں ہندو مسلم فساد کا تماشا یوں تو ہمیشہ اور ہر جگہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ مارچ ۱۹۴۱ء کی سترھویں تاریخ کو پیر کے دن ڈھاکہ میں ہندو مسلم فساد کی بدولت ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ زندگی میں کبھی کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہو۔

یوں تو پریشان کرنے والی بازاری خبریں کئی روز سے اڑ رہی تھیں۔ لیکن ایسا بھی خیال نہ تھا۔ کہ جوالا مکھی پہاڑ اس طرح اچانک پھٹ پڑے گا۔ اور آگ، خون اور موت کا طوفان سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ ہنگامہ تو دوپہر سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن دن کے چار بجتے بجتے یہ حالت ہوگئی جیسے برٹش راج ختم ہوگیا اور امن وامان کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ زمین سے آسمان تک جدھر دیکھئے آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی۔

دھوئیں کے بادل سارے شہر پر چھا گئے تھے گھر جل رہے تھے، دکانیں جل رہی تھیں مکانوں پر ہتوڑے بج رہے تھے۔ دروازے توڑے جا رہے تھے، بازار لٹ رہے تھے۔ پوری حیوانیت کے ساتھ ہر چیز برباد کی جا رہی تھی۔ معصوم انسان قتل ہو رہے تھے۔

کسی نے پیچھے سے چھری بھونک دی۔ کسی نے لوہے کے ڈنڈے سے سر پھاڑ دیا۔ کوئی خون میں نہایا ہوا آہ کر کے یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے نکل پڑیں۔ کہیں کوئی زخمی پڑا سسک رہا ہے۔ کہیں کوئی لاش پڑی ہے۔ کتنے بدنصیبوں کو کفن تک میسر نہ ہوا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اللہ اکبر اور بندے ماترم کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ ہنگامہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ کسی کی جان، مال، عزت، کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ گورمنٹ کی تمام ذمہ داریاں ختم ہو چکی تھیں۔ ہر شخص کو پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ نہ جو اس کا جی چاہے سو کرے۔ انسان جنگلی جانوروں سے بدتر ہو گئے تھے۔ دوست دشمن میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ اکا دکا مسلمان یا ہندو، بھولا بھٹکا، دشمنوں کے محلے میں پہنچا۔ اور موت کا شکار ہوا۔

اور پھر یہ مرنے والے تھے کون؟ اکثر بے خطا، بے قصور لوگ، پردیسی، مسافر غریب۔ کوئی گھاس بیچنے والا، کوئی گاڑی ہانکنے والا، کوئی بھیک مانگنے والا۔ کوئی پاگل، کوئی اپاہج۔ ایک بدقسمت، غریب۔ دیہاتی، سرکاری ہسپتال سے مفت کی دوا لینے آیا تھا۔ نسخہ اور دوا کی ٹوٹی ہوئی شیشی اس کی لاش کے پاس پڑی ہوئی ملی۔ دین داروں

نے مذہب کی خاطر حیوانیت کے وہ کارنامے پیش کئے کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ انہوں نے فقط بوڑھے اور مردوں ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا۔ بلکہ بوڑھی عورتوں اور کم سِن معصوم بچوں کا خون بہانا اپنا دینی فرض سمجھا اور سب سے زیادہ قیمتی یعنی انسانی قربانی پیش کر کے اپنے دیوتاؤں کو خوش اور اپنے خدا کو راضی کیا۔

ہندو مسلم بلوائیوں کے گروہ دشمن کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ مگر اب تک انہوں نے جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کہیں نہیں کیا تھا۔ غنڈوں اور بدمعاشوں کی بن آئی تھی۔ اِن شیطانوں کے زیر اثر بہت سے آوارہ نالائق اور بیکار لوگ لوٹ مار میں شامل ہو گئے تھے۔ اور مردوں کا تو ذکر ہی کیا، عورتیں تک لٹی ہوئی دکانوں سے چھوٹی موٹی چیزیں اٹھالے جا رہی تھیں۔ پھر لطف یہ کہ پولیس اور فوج کے سپاہی ہر خطرناک جگہ پر تعینات تھے۔ اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ یہ کھڑے دیکھتے ہی رہے اور دکانوں میں سے مال غائب ہو گیا۔ دِن دہاڑے ان کی آنکھوں کے سامنے خون ہو رہے تھے۔ وہ نہایت بے پروائی بلکہ بے دردی کے ساتھ یہ تماشا دیکھتے تھے۔ اور کسی سے کچھ نہ کہتے تھے۔ یہ ہنگامہ اُن کے لئے ایک اچھا خاصا مذاق اور تفریح کا شغل تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے اس کے عادی ہیں۔ اور ان کا فرض اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوٹ مار کر کے جب کوئی چوری کا مال لے کر اُن کے سامنے سے گزرے تو اُسے روک لیں اور جو چیز انہیں اچھی لگے وہ بے تکلف اس سے رکھوا لیں۔ اس سے انہیں کچھ بحث نہ تھی۔ کہ لانے والا کہاں سے لایا اور کس طرح لایا۔

میں اُس وقت ۱۴۷ بیگم بازار روڈ پر رہتا تھا۔ بیگم بازار مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس لئے میرا گھر ہر قسم کے خطرے سے بچا ہوا تھا۔ میرے مکان کی بغل ہی میں بنئے کی ایک دکان تھی۔ چودہ پندرہ آدمی اس دکان پر کام کرتے تھے۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ کاروبار کتنا بڑا تھا۔ گھر میں اس وقت ہم صرف دو آدمی تھے۔ ایک میں اور دوسرا میرا نوکر "سلارو" مکان کی دوسری منزل میں ہم لوگ رہتے تھے۔ رات ہوگئی۔ اندھیرے میں آسمان تک پہنچنے والی آگ اور بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتی تھی۔ رات کے دس بج گئے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھے پہرا دے رہے تھے۔ میں بھی برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ سلارو لالٹین ہاتھ میں لئے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اِدھر اُدھر کی چھتوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔ یکایک برابر کی چھت پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کان کھڑے کئے۔ سلارو فوراً اُدھر جھپٹا اور منڈیر پر سے جُھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ کسی سے کھسر پھسر کی۔ پھر میرے پاس آیا اور کہا "میاں! دکان والے لالا اور ان کے آدمی کہتے ہیں کہ ہماری جان خطرے میں ہے۔ اپنے صاحب سے کہو کہ رات کی رات ہمیں اپنے گھر میں چھپا لیں۔ عمر بھر احسان نہ بھولیں گے"۔

اس وقت یہ لوگ واقعی میری مدد کے محتاج تھے۔ اور انسانی ہمدردی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ میں انہیں اپنے گھر میں پناہ دوں۔ لیکن یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے کہا "سلارو! اگر کسی نے ان لوگوں کو ہمارے گھر میں آتے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ یہ لوگ مارے ہی جائیں گے۔ لیکن ہم پر بھی آفت آئے گی۔ سارے محلے سے

دشمنی ہو جائے گی، اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوگا۔ وہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہمارے گھر میں آئیں گے کس طرح؟ دروازے کی طرف سے تو آ نہیں سکتے۔ سڑک پر نکلے اور مارے گئے۔ ہمارا مکان دو منزلہ، اُن کا ایک منزلہ۔ کوئی سیڑھی بھی نہیں جو چڑھ کر آ جائیں ؟ سلارو نے چپکے چپکے یہ باتیں اُن سے کہہ دیں۔ انھوں نے کہا۔ ہماری چھت پر بہت سے خالی صندوق پڑے ہیں۔ انہیں کو نیچے اوپر رکھ کر اوپر چڑھ آئیں گے؟ میں اجازت دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان لوگوں کو میرے گھر میں دیوار پر سے اُترتے ہوئے کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ سلارو نے کہا "میاں! خدا پر نظر رکھیے۔ ان لوگوں پر وقت پڑا ہے۔ ان کی ضرور مدد کیجیے۔ خدا آپ کی مدد کرے گا۔ آخر میں نے ہمت کی اور کہہ دیا کہ اچھا آنے دو۔

ان لوگوں نے نیچے اوپر صندوق رکھ کر ایک سیڑھی سی بنالی، اور ایک ایک کر کے سات آدمی برآمدے کی چھت پر چڑھ کر آنگن میں اُتر آئے۔ آخری آدمی اُترتے وقت گھبراہٹ میں گر پڑا۔ فوراً ایک محلے والے نے آواز دی۔ "سلارو بھیّا! یہ دھم سے کیا گرا؟" اس سوال سے میں تو سٹ پٹا گیا۔ لیکن سلارو کا دماغ حاضر تھا۔ اس نے فوری جواب دیا "بھیّا! میں خود ہی گر پڑا، چھت پر چڑھ رہا تھا؟ بات ختم ہوئی۔ مجھے بھی اطمینان ہوا۔

یہ سب لوگ بھوکے تھے۔ میں نے کہا "میں جانتا ہوں آپ لوگوں کی غذا چاول ہے مگر چاول اس وقت گھر میں موجود نہیں۔ اور کہیں سے مہیا بھی نہیں ہو سکتے، البتہ دال آٹا نمک مرچ، گھی تیل وغیرہ سب سامان موجود ہے۔ پکائیے اور کھائیے، انھوں نے انکار کر دیا۔ میں نے

دالان میں دری کا فرش کرادیا۔ اس پر وہ لوگ لیٹ گئے۔ سویا تو کوئی نہیں لیکن مردوں کی طرح چپ چاپ پڑے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ سلارو نے کہا "میاں! اب آپ بھی لیٹ جایئے۔ میں جاگ رہا ہوں۔ نیند کے مارے میری بری حالت تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ شاید ایک گھنٹہ سویا ہوں گا۔ اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ وہ لوگ آپس میں کچھ کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ اور سلارو دیوار کے پاس بیٹھا، لالٹین ہاتھ میں لیئے اونگھ رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہم دو ہیں اور یہ سات۔ اگر ان کی نیت بگڑ جائے تو ہم دونوں کو بڑی سہولت اور آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پلنگ کے قریب ہی کوئی شخص کھڑا ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ مگر میرا خیال غلط تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ہوا یہ کہ میرے کمرے میں قدآدم آئینہ رکھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کسی ضرورت سے اُٹھا تھا۔ آئینے میں اس کا عکس پڑا اسی نے مجھے ڈرا دیا۔ توبہ! اس رات کو میں کتنا ڈرپوک ہو گیا تھا۔ اپنی بدگمانی پر مجھے خود ہی شرم آئی۔ میں نے اپنے جی میں کہا "کچھ بھی ہو۔ انسان آخر انسان ہے۔ اتنا ذلیل کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ اپنی جان بچانے والے کے ساتھ دھوکا کرے۔ میں پھر لیٹ گیا۔ اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ باقی رات...... آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا اور پورے طور پر صبح نہ ہونے پائی تھی۔ کہ پھر وہی شور و غل، وہی ہنگامہ۔ شہر بھر میں ایک، تہلکہ مچا ہوا تھا۔ رات ہی رات میں کئی خوبصورت اور شاندار

عماریں راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ شام کو محل صبح کو کھنڈر۔ سچ مچ کتنے لاکھ کے گھر خاک ہو گئے۔ اسی وقت دیوار کے پیچھے پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ سلارو نے جھانک کر دیکھا لالا کے باقی چھ آدمی ہاتھ جوڑ کر زمین پر ناک رگڑنے لگے کہ خدا کے واسطے ہمیں بھی بچاؤ۔ اس وقت ان لوگوں کا چھت پر چڑھ کر ہمارے گھر میں آنا، رات سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ کچھ لوگ تو صبح کی نماز کیلئے مسجدوں میں گئے ہوئے تھے۔ اور کچھ اپنی دوسری ضرورتوں سے ابھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ان آدمیوں کو دیوار پر چڑھتے اور ہمارے گھر میں اترتے کسی نے نہیں دیکھا۔

اس وقت ان لوگوں کی حالت رحم کے قابل تھی۔ صورت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آدھی جان نکل چکی ہے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ قدم ڈگمگاتے تھے۔ زبان لڑکھڑاتی تھی۔ صاف لفظ منہ سے نہیں نکلتے تھے۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہوا۔ اور کانپنے لگے۔ ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ ایک آدمی نے بہت سے نوٹ دھوتی میں لپیٹ کر اپنی کمر سے باندھ رکھے تھے۔ گانٹھ شاید کچھ ڈھیلی تھی۔ دیوار سے اترنے میں کھل گئی۔ اور نوٹوں کا مٹھا نکل پڑا۔ بس یہ معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کی جان نکال لی۔ اُسے غش سا آ گیا۔ وہ خود بھی نوٹوں کے اس مٹھے پر گر پڑا۔ سلارو نے جھپٹ کر اسے سہارا دیا۔ اور کھڑا کیا۔ پھر جھک کر نوٹوں کا مٹھا اُٹھانے لگا۔ نوٹوں کے مالک کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اُف! کس قدر بھیانک ہو گئی تھی۔ اُسکی صورت۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لٹ گیا۔ میں نے وہیں سے پکارا۔ خبردار سلارو! تم ہاتھ نہ لگانا۔

اس نے کہا میاں! میں تو اٹھا کر دے رہا تھا۔ میں نے کہا تمہیں اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لالا خود اُٹھا لیں گے۔ لالا نے نوٹوں کا بنڈل اٹھا لیا۔

مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ ان نوٹوں کے نکل پڑنے سے وہ سب لوگ بے حد پریشان ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ اور بھی چند لوگوں کے پاس نوٹ تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں ریشمی رومال کی ایک پوٹلی اور چک بک تھی۔ دوسرے کی قمیص کی جیب بہت پھولی ہوئی تھی۔ تیسرے نے دامن میں کچھ لپیٹ رکھا تھا۔ وہ گھبرا کر اوروں کے پیچھے جا چھپا۔ شاید انہیں یہ اندیشہ تھا کہ میں اور سلاؤ ان سب کا جھاڑ لے کر ان کی ساری دولت ان سے چھین لیں گے۔ اور لوٹنے کے بعد انہیں قتل بھی کر دیں گے۔ تاکہ لوٹ کا بھید کھلنے نہ پائے۔ ایک آدمی گردن جھکائے بیٹھا رہا تھا میں نے کہا بھائی خدا کو یاد کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ اس نے کہا۔ اجی حضور ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ نوکری کرنے کانپور گئے تھے۔ وہاں بھی رائٹ (RiOT) ہو گیا تھا۔

دن کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "اب آپ لوگ برابر والے کمرے میں چلے جائیے۔ ممکن ہے برآمدے میں کوئی آپ کو دیکھ لے" وہ سب کمرے میں چلے گئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے وقت ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند کر لیجیے۔ اور آرام واطمینان سے بیٹھیے۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رات تو جوں توں کٹ گئی۔ اور کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ مگر دن کیونکر گزرے گا۔ اور کس طرح یہ لوگ صحیح سلامت یہاں سے کسی دوسری جگہ پہنچائے جاسکیں گے۔

میں نے بہت غور کیا۔ مگر اس مشکل کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔ یوں عجیب غریب باتیں تو بہت سی دماغ میں آئیں۔ لیکن معقول تدبیر کوئی نہ سُوجھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ کسی صورت سے آپ ہمیں اسٹیشن پہنچا دیجئے۔ ہم میمن سنگھ چلے جائیں گے۔ ان میں سے اکثر میمن سنگھ کے رہنے والے تھے۔ مگر اسٹیشن تک پہنچیں تو کیونکر۔

سُلارُو نے کہا "میاں! دو گھوڑا گاڑیاں لئے آتا ہوں۔ ان کے پٹ چڑھا دینگے۔ کوچبین کے برابر میں بیٹھ جاؤں گا۔ لوگ سمجھیں گے گھر کی سواریاں جا رہی ہیں" میں نے کہا "ارے اُلّو! لوگ کیا اتنے بیوقوف ہیں کہ اس طرح فریب کھا جائیں گے؟ انہیں یہ خیال نہ آئے گا۔ کہ صاحب تو اکیلے رہتے ہیں۔ رات ہی رات میں اتنی پردہ نشین عورتیں گھر میں کہاں سے آگئیں؟ یہ سب تو بیکار باتیں ہیں۔ تو ایک کام کر۔ سائیکل لے اور وائس چانسلر صاحب کے یہاں چلا جا۔ میں خط میں بھی لکھے دیتا ہوں اور تو زبانی بھی کہہ دینا کہ تیرہ ہندو ہمارے گھر میں پوشیدہ ہیں۔ اُنہیں کسی طرح اسٹیشن پہنچوائیے۔ اور اگر آپ کچھ نہ کر سکیں تو اپنی کار بھیج دیجئے۔ تاکہ میں خود جا کر کمشنر اور کلکٹر سے ملوں۔ اور ان لوگوں کو کہیں بھیجنے کا انتظام کروں۔ اور ہاں اُن سے یہ بھی پوچھنا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ جلدی میں کاغذ اور لفافہ بھی نہ ملا۔ اشتہار کا ایک پرچہ میز پر پڑا ہوا تھا۔ اٹھا کر اُسی کی پیٹھ پر خط لکھ دیا۔

سلارو نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ اس وقت اپنے محلے سے باہر جانے میں جان کا خطرہ تھا۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی۔ دن کے آٹھ بجے تھے سلارو کو اس

طرف روانہ کرنے کے بعد میں لالا لوگوں کے پاس گیا۔ وہ بہت گھبرا رہے تھے۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ اور پھر دالان میں آکر ٹہلنے لگا۔ تنہائی کی وجہ سے میرا جی بھی گھبرا رہا تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر موہم دار کی کوٹھی کچھ ایسی دور نہ تھی۔ سائیکل پہ جانے آنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ خرچ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر نو بج گئے اور سلارو کا کہیں پتہ نہیں۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے مگر سلارو نہ آج آتا ہے۔ نہ کل۔ طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے۔ میں حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں گیا۔ محلے کے چند بھنگی سلارو سے ملنے آئے تھے۔ کیا خوب ملاقات کا اچھا وقت نکالا۔ ساڑھے دس بج گئے۔ سلارو پر مجھے غصہ آرہا تھا کہ کمبخت کہاں جاکر بیٹھ رہا۔ پھر خود ہی جی میں کہتا میں ناحق اس پہ ناراض ہو رہا ہوں۔ خدا جانے کیا بات ہے۔ اسکی جان کی خیر ہو۔ دل ہی دل میں اس کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

ٹھیک گیارہ بجے سلارو واپس آیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اور پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اس نے کہا، جاتے وقت تو میں خیریت سے چلا گیا۔ لیکن لوٹتے ہوئے راستے میں کئی بار ہندوؤں نے میرے اوپر حملہ کیا۔ حملہ کرنے والوں کی تعداد پندرہ بیس سے کم نہ تھی۔ میں بڑی تیزی سے بھاگا۔ تب کہیں جان بچی۔ آخری بار تین ہندوؤں نے مجھے گھیرا۔ خدا کی شان! اسی دم نتّو لال (ہمارا دھوبی) اور اس کے دونو بیٹے وہاں آپہنچے۔ انہوں نے میری حمایت کی۔ پہلے تو ان لوگوں کو منع کیا۔ کہ میرے اوپر ہاتھ نہ چھوڑیں۔ مگر جب دیکھا کہ ان کا ارادہ کچھ اور ہے تو ہم سب نے قریب کی

ٹال سے لکڑیاں اُٹھالیں۔ اس پر وہ لوگ چلے گئے۔ اور ننّو لال اور اس کے بیٹے مجھے ہندو محلّے کے ختم تک پہنچا گئے۔

ڈاکٹر موجِم دار (وائس چانسلر) کو جس وقت میرا خط ملا وہ ناشتا کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو اس میں لگی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر باغ کے بارے میں اپنے مالی کو کچھ سمجھانے لگے۔ اور اس کے بعد اسی قسم کے کسی دوسرے "ضروری" کام میں لگ گئے۔ ان کاموں سے جب فرصت ہوئی تو اطمینان سے کلکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ آخر ایسی جلدی ہی کیا تھی۔ کلکٹر صاحب بہادر، اس خاص اور نازک موقع کے لحاظ سے وائس چانسلر صاحب سے بھی زیادہ مستعد ثابت ہوئے۔ یعنی نو بجے انہیں اطلاع ملی اور پورے بارہ بجے انہوں نے ایک اعلیٰ افسر کو ہتھیار بند گارڈ کے ساتھ میرے یہاں بھیج دیا۔

کار جس وقت میرے مکان کے قریب آ کر رکی تو محلے کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ محلے والے آج تک میرا بہت خیال کرتے تھے۔ افسر نے ایک سپاہی کو تو کار کی چوکسی کے لئے تعینات کیا۔ اور باقی تین سپاہیوں کو لے کر میرے دروازے پر آئے۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ سلام دے پیچھے گیا اور آ کر مجھے اطلاع دی کہ جنٹ صاحب ہیں۔ محلے والوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ تعجب اور بدگمانی کی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میری بابت کسی نے مخبری کی ہے۔ مجھ پر کوئی تہمت لگائی ہے اور جنٹ صاحب مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اسلامی غمخواری کے جذبات ان کے سینے

میں مچلنے لگے۔ اور انہوں نے قطعی طور پر طے کر لیا کہ اگر جنٹ صاحب مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو وہ اُن پر اور اُن کے ساتھیوں پر حملہ کر دیں۔ میں نیچے آیا۔ لوگ اب سمٹ کر بالکل دروازے کے قریب آ گئے۔ جنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں کہا۔ "ہلو ڈاکٹر شادانی! یہ سب کیا ہنگامہ ہے۔ یہ اتنے ہندو تمہارے گھر میں کیسے آ چھپے۔ اور یہ ہیں کون لوگ؟ میں سٹ پٹا گیا۔ میں نے کہا۔ خدا کیلئے چپ رہیئے۔ اندر آ کر باتیں کیجئے۔ وہ اور اُن کے دو ساتھی اندر آ گئے۔ میں نے دروازہ بند کر لیا۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ جنٹ مسٹر رائے آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ میری اُن کی ولایت کی ملاقات تھی۔ میں نے مسٹر رائے کو سارا قصہ سُنایا۔ انہوں نے کہا۔ "آپ نے تو کمال کر دیا" پھر کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ آخر یہ طے پایا کہ ان لالا لوگوں کو موٹر میں بٹھا کر اسٹیشن پہنچا دیا جائے۔ ایک لالا جو دکان کے مالکوں میں سے تھے۔ چلتے وقت میرے کمرے میں آئے۔ ہاتھ جوڑ کے سو روپے کا ایک نوٹ میرے سامنے رکھا اور کہنے لگے۔ "غرض یہ ہے کہ حضور نے ہماری جان بچائی۔ ہم آپ کے بہت احسانمند ہیں۔ ہم سب کی طرف سے یہ نذرانہ قبول فرمایئے۔" میں نے کہا لالہ! میں نے سو روپے کے لالچ سے آپکی جان نہیں بچائی۔ نوٹ اپنے پاس رکھئے۔ آپ کے کام آئے گا۔" کتنے کم حوصلہ اور پست خیال تھے یہ لوگ! سات روپیہ گیارہ آنے ایک پائی کو ایک جان کا معاوضہ یا قیمت سمجھتے تھے، خوب! اور بہت خوب! میرے مکان سے نکل کر یہ لوگ موٹر کی طرف اس طرح جھپٹے جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہو کر اپنے گھر کی

راہ لے۔ موٹر میں چار آدمیوں سے زیادہ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ مگر مسٹر رائے نے زبردستی سات آدمیوں کو اس میں ٹھونس دیا۔ اس طرح دو پھیروں میں وہ لوگ اسٹیشن پہنچائے گئے۔

محلہ والوں کو اب معلوم ہو گیا کہ بات کیا تھی۔ مسٹر رائے کے جانے کے بعد وہ لوگ اکٹھے ہو کر میرے پاس آئے۔ وہ بہت غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ لڑنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ میں نے کہا اندر تشریف لے آئیے۔ مگر وہ دروازے ہی پر کھڑے رہے۔ ایک شخص بولا "کیوں جناب! یہ آپ نے کیا کیا؟ ابھی میں کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ دوسرا برابر سے بولا "بڑے رحم دل ہیں آپ۔ مسلمان تو کافروں کے ہاتھ سے کتے بلی کی طرح مارے جا رہے ہیں۔ اور آپ نے ان حرامزادوں کو اپنے گھر میں چھپایا۔ تیسرے نے آگے بڑھ کر کہا۔ "کاش ہمیں پہلے سے خبر ہوتی۔ ہمیں تو اب معلوم ہوا ہے کہ یہی مردود رائے" تھا۔ کل اسی کے حکم سے فائرنگ ہوا۔ اور خود اس نے چار بے گناہ مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اگر ذرا دیر پہلے بھی ہمیں پتہ چل جاتا۔ تو قسم قرآن کی اس کافر بچے کو ہمیں ٹھنڈا کر دیتے۔

میں نے کہا "اگر آپ ایسا کرتے تو غلطی کرتے۔ طاقت کا استعمال ہر موقع پر صحیح نہیں ہوتا۔ آپ لوگ نہتے" تھے۔ اُن کے پاس بندوقیں اور تمنچے تھے۔ خدا جانے کتنوں کی جانیں جاتیں اور کتنے آباد گھر برباد ہو جاتے۔ اس نے کہا۔ خوب جیسے ہم مٹی یا گھاس پھونس کے بنے ہوئے ہیں۔ مگر اب کچھ کہنا فضول ہے۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ورنہ دکھا دیتے۔ اس کو بھی دیکھ لیتے اور اُس کے حمایتی کو بھی دیکھ

لیتے"۔ ایک اور شخص سب کے پیچھے سے بولا "ہائے، وہ لونڈا یوسف کیسا مارا گیا۔ کمبخت پہ ابھی پوری جوانی بھی تو نہیں آئی تھی۔ ماں نے کیسے ارمان سے شادی کی تھی۔ دوسرے نے کہا۔ ہاں، مگر عقد ہی ہوا تھا۔ رخصت نہیں ہوئی تھی۔ دلہن بیچاری تو بیاہ ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔ ان باتوں سے لوگوں کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھے۔ میں چپ کھڑا سن رہا تھا۔

ایک بزرگ میری طرف گھور کر فرمانے لگے۔ یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا مگر آپ نے بڑا دین کا کام کیا۔ بڑی اسلام کی خدمت فرمائی۔ اللہ رسول آپ سے بہت خوش ہوں گے۔ آپ نے تو دنیا ہی میں جنت خرید لی۔ دوسرا بولا۔ اچھا یہ تو فرمایئے آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوا؟ کوئی تخت ملے گا؟ تاج ملے گا؟ عہدہ ملے گا؟ آخر کیا ملے گا؟ تیسرے نے کہا: "فائدہ کیوں نہیں ہوا۔ اخباروں میں نام چھپے گا۔ ملکوں ملکوں میں مشہور ہو جائیں گے"! ایک بدتمیز لڑکے نے کچھ اور بھی جہالت کی باتیں کیں۔ غصہ تو مجھے بہت آیا۔ جی چاہا کہ ایک طمانچہ اس کے منہ پر ماروں۔ مگر موجودہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے صبر و برداشت سے کام لیا۔ ان کے کسی اعتراض کا جواب دینا محض بے سود تھا۔ ایسی بے معنی باتوں کا جواب دینے سے چپ رہنا ہی بہتر تھا۔ میں نے انھیں دھیما کرنے کے لئے کہا۔ مجھے بہت افسوس بلکہ رنج ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ بیشک مجھ سے زبردست غلطی ہوئی۔ میں نے اس وقت غور نہیں کیا تھا۔ اور خدا گواہ ہے یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا کہ اس کمبخت راۓ نے کل چار مسلمانوں کو شہید کیا۔ مجھے اپنی

اس حرکت پر خود شرم آرہی ہے۔ خدا میرے گناہ کو معاف کرے۔ اور آپ لوگ بھی معاف کر دیجئے۔ سچ کہتا ہوں اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ مسلمان اس طرح مارے گئے۔ اور مارے جا رہے ہیں تو میں ان کافروں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ اور اب آپ سے گزارش ہے کہ اگر کہیں سے کوئی ہندو ہاتھ آجائے تو اُسے یہاں لے آیئے میری دلی تمنّا ہے کہ میں اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب زندگی بھر کسی ہندو۔۔۔۔۔

ایک شخص نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اب آپ ہمیں بہلایئے مت۔ ہم بچے نہیں ہیں۔ مگر آپ نے اچھا نہیں کیا۔" وہ لوگ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اور میں بھی دروازہ بند کر کے واپس آگیا۔ تین روز کے بعد ایک حد تک شہر میں امن و امان ہوگیا۔ لوگ اپنے معمولی کاروبار میں لگ گئے۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ محلے والوں کے دلوں میں میری جو عزت تھی۔ وہ اس دن کے بعد سے کافور ہو چکی تھی۔ میں نے جس چیز کو انسانی فرض سمجھا تھا۔ وہ میرے لئے بلائے جان ہوگئی۔ اور مجھے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جب میں باہر نکلتا تو ایک دوکاندار دوسرے کو آواز دے کر کہتا: "سنا ہے کافروں کو اپنے گھر میں چھپانے والوں کو جاگیر ملے گی۔" دوسرا جواب دیتا۔ "ہاں۔ اور خان بہادری کا ٹائیٹل بھی۔ اور پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ۔" تیسرا کہتا۔ "ابے تنخواہ نہیں پنسن (PENSION) چوتھا کہتا: "اور خدا کے یہاں جنت بھی۔ پھر سب مل کر قہقہہ لگاتے۔ میں چپ چاپ اس کوچے سے گزر جاتا۔

روزمرہ محلے والے کوئی نہ کوئی حرکت میرے خلاف ضرور کرتے تھے۔ مگر میں نے گوارا نہ کیا۔ کہ بزدلوں کی طرح گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ ان لوگوں نے جب دیکھا کہ یہ شخص بڑا ہی ڈھیٹ اور ضدی ہے تو میرے بائیکاٹ کی ٹھہرائی اور اس بارے میں دو چار مسئلے جاننے والے ایک ٹٹ پونجئے مولوی سے جس کے بزرگ کسی زمانے میں شہر کے قاضی رہ چکے تھے۔ فتوے بھی لکھوا لائے۔ مسجد کے ملّا نے اس پر مہر کردی۔ چلئے بائیکاٹ کا انتظام مکمل ہو گیا۔ اب ایک منٹ کیلئے بھی اس محلّے میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسلئے اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس قسم کی کوئی کارروائی کریں۔ میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ اور اچھا مکان نہ ملنے کی وجہ سے کئی سال تک بہت تکلیف اُٹھائی۔

فساد کی آگ جب ذرا دھیمی ہوئی تو گورنمنٹ کی طرف سے اعلان ہوا کہ سارے محلّہ پر تعزیری ٹیکس (PUNITIVE TAX) لگایا جائے گا۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے کمشنر کے یہاں عرضی دی کہ ہم لوگوں کو فساد سے کیا واسطہ۔ ہم نے تو فساد کو دبانے اور مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس لئے ہم لوگوں سے یہ ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ جواب ملا کہ ہر شخص الگ الگ ٹیکس کی معافی کے لئے عرضی دے۔ اس پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ سرکار کے اس وعدے سے یہ امید کچھ بیجا نہ تھی۔ کہ کم سے کم یونیورسٹی والے اس جرمانے سے بچ جائیں گے۔ میں نے بھی عرضی دی اور اس میں یہ لکھا کہ: "میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تیرہ ہندوؤں کی جان بچائی۔ سارے محلے کو اپنا دشمن بنایا۔ اور اسی کی بدولت مجھے محلہ چھوڑ کر بھاگنا اور بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ گواہی اور

ثبوت کی ضرورت ہو تو ڈاکٹر موجم دار، وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی اور مسٹر رائے جوائنٹ کلکٹر موجود ہیں۔" عرضی پر پوری ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بعد سرکار نے جو فیصلہ کیا اس کی اطلاع میرے پاس بھیج دی۔ لکھا تھا۔ "تمہیں آدھا ٹیکس معاف کر دیا گیا"

میں اس شاہی انعام کی اطلاع پا کر دنگ رہ گیا۔ بلکہ مزہ آ گیا۔ واقعی گورنمنٹ نے بڑی مہربانی، بڑی عنایت کی کہ آدھا ٹیکس یعنی جرمانہ معاف کر دیا۔ ورنہ جو قصور میں نے کیا تھا اسکی سزا اس سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ آخر میں نے تیرہ ہندوؤں کو ساری رات اور آدھے دن اپنے گھر میں بند رکھا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ میرے اوپر حبس بیجا کا الزام قائم کر کے مجھ پر مقدمہ چلایا جاتا اور مجھے قید یا بھاری جرمانے کی سزا دی جاتی۔ آخر گورنمنٹ کا قانون کس دن کے لئے اور کس مرض کا علاج ہے۔ اگر بے قصور لوگوں سے جرمانے وصول نہ کئے جائیں تو گورنمنٹ کے خزانے کس طرح بھریں۔ میں نے اپنے دل میں سرکار کی قدردانی کا شکریہ ادا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں بہت سستا چھوٹا۔ ورنہ خدا جانے مجھ پر کیا مصیبت آتی اور میں کہاں کہاں کھنچا کھنچا پھرتا۔

جن لوگوں کو زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔ انہیں اس معاملے سے سبق لینا چاہیئے۔ میں تو اپنی اولاد کو وصیت کر جاؤں گا۔ کہ انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کر اگر کبھی ان کے دل میں کسی کی جان بچانے کی خواہش پیدا ہو تو انہیں کم سے کم جرمانے کی سزا بھگتنے کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری مہربان گورنمنٹ اپنے قانون کے مطابق سوشل سروس کا اتنا ہی معاوضہ دیتی ہے اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر انعام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

سچّی کہانی

جھوٹ موٹ کی ایک کہانی

کچھ دن ہوئے ایک صاحبہ کا خط آیا۔ لکھا تھا:۔

"مدت سے آپ کا کوئی افسانہ نظر سے نہیں گزرا۔ کیا آپ نے لکھنا چھوڑ دیا؟ آخر کیوں؟

میں نے جواب دیا:۔

"میں افسانہ نگار نہیں، وقائع نگار ہوں۔ میرا دماغ افسانے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جو کچھ دیکھتا ہوں یا سُنتا ہوں اسی کو اپنے لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں۔ آپ کوئی واقعہ سنائیے۔ میں اسے لکھ دوں گا۔"

انہوں نے ایک طویل خط بھیجا اور لکھا کہ:۔

"واقعہ تو نہیں۔ "جھوٹ موٹ کی ایک کہانی" سناتی ہوں۔ پسند آئے تو

تو اصلاح کر کے چھپوا دیجئے۔"

میں نے اسے پڑھا اور پسند کیا۔ مگر عبارت میں خامیاں بہت تھیں۔ لہٰذا پوری کہانی کو از سرِ نو لکھا۔ بعض اشعار ناموزوں تھے۔ ان کی اصلاح کی۔ اب اس کی یہ صورت ہے:۔

"سچ ہے امیروں کا مزاج کسی نے آج تک سمجھا نہیں۔ کبھی گستاخی کی سزا انعام کبھی پرستاری کا صلہ نامرادی۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ مگر قسمت کو خواہ مخواہ کیوں الزام دیا جائے۔ عمل کی پاداش ہر ایک کو ملتی ہے۔ ہم نے بھی جیسا کیا ویسا پایا۔ دو بیگانوں میں شناسائی کیا ہو نہیں جاتی ہے۔ پھر شناسائی کو محبت کیوں بنایا؟ محبت کو پرستاری کے درجے پر کیوں پہنچایا۔ اب نامرادی کا شکوہ کیا؟

غیر ممکن ہے مکافاتِ عمل سے بچنا
نامرادی ہے صلہ میری پرستاری کا

لو میں پھر بھٹکنے لگا۔ خدا جانے دماغ کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ ادھر خیال گیا اور بہکا۔ کہنا یہ تھا کہ پہلے تو انہوں نے ایک مُرجھائے ہوئے پھول کو خدا جانے کیا سمجھ کر اپنے گریبان میں رکھ لیا تھا۔ پھر شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ گریبان سے نوچ کر اسے پھینک دیا اور پیروں سے مسل ڈالا۔ جسے اختیار ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجبور کیا کرے۔ آنکھوں سے بے بسی نے دل کے خون کی دو بوندیں ٹپکائیں اور خاموش۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہوا۔ وہی دنیا جس میں چاندنی اور پھول

کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا یکایک کیسی تاریک، کیسی ویران، کیسی بھیانک ہو کر رہ گئی ؎

اللہ وہ قربت کے لمحے، دل کا یہ عالم تھا جیسے
پھولوں کی جوانی میری ہے، تاروں کا تبسم میرا ہے
اک تیری نگاہیں کیا بدلیں، دنیا بدلی، قسمت بدلی
یا سب کچھ تھا، یا کچھ بھی نہیں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے

وقت کا چارہ گر دل کے زخموں پر بھول کا مرہم لگاتا رہتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کیونکر جئے۔ اور پھر بھی سچ پوچھو تو یہ جینا کچھ جینا نہیں ہوتا۔ چاروناچار ساعتوں کا شمار پورا کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال وقت گزر رہا تھا۔ بیتے ہوئے دنوں کی یادیں کبھی ان زخموں کو چھیڑ دیتی تھی تو بے اختیار دل سے اک آہ نکل جاتی تھی یا پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔ محبت کی داستان کا آغاز و انجام بس اتنا ہی تو ہوتا ہے ؎

کچھ سرد آہیں کچھ گرم آنسو
کیا مختصر ہے میری کہانی

ہاں تو بہرحال وقت گزر رہا تھا۔ کہ ایک دن ڈاکیئے نے ڈاک لا کر دی۔ کئی خط۔ کئی رسالوں کے پیکٹ۔ سرسری نظر سے میں پتے دیکھتا گیا اور ایک طرف رکھتا گیا کہ ایک رسالے کے پیکٹ پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اچانک گھور اندھیرے میں آنکھوں کے آگے بجلی سی کوند گئی۔ بند بند میں ایک

خفیف سی لرزش محسوس ہوئی اور دل کی حرکت تیز ہو گئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں برآمدے میں سے اپنے کمرے میں چلا آیا اور پتے کی تحریر کو بہت غور سے دیکھا۔ غور کی ضرورت نہ تھی۔ آنکھوں نے پہلی ہی نظر میں ان مہتابی کرنوں کے لئے دل کے جھروکے کھول دیئے تھے۔ تبھی تو دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ کمرے سے نکل کر میں پھر برآمدے میں چلا آیا۔ کیوں؟ خدا جانے کیوں؟ جیسے کوئی دیوانہ ہو۔ پھر برآمدے میں کچھ دیر گردش کی۔ پیکٹ ہاتھ میں۔ کتنی ہی دیر میں اسے کھولا۔ اردو کا ایک مشہور رسالہ۔ ایک ایک ورق الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی خط اس میں نہ تھا۔ پھر فہرست مضامین پر نظر ڈالی۔ ایک مضمون کے سامنے ایک نشان بنا ہوا تھا۔ وہی صفحہ نکالا۔ ایک پیراگراف کو سُرخ پنسل کی لکیر سے گھیر دیا گیا تھا۔ عبارت یہ تھی:۔

"جس دن تم آنے والے تھے۔ زیبا نے تمہاری پذیرائی کا بڑا اہتمام کیا تھا۔ بڑے رومانی انداز سے کمرے کو سجا کر دُلہن بنایا تھا اور خود بھی دُلہن بنی تھی۔ بازوؤں میں پھول، گلے میں پھول، بالوں میں پھول، بس پھول ہی پھول۔ بہار کی دیوی بن گئی تھی تمہاری زیبا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور وہ تمہارے یہ اشعار گنگنا رہی تھی جو تم نے پہلی بار اس کے بالوں میں سفید پھول دیکھ کر بیساختہ کہے تھے ؎

گلداں میں ہو کہ شاخ پہ ہو ہر حال میں پھول خوشنما ہے

لیکن زلفِ سیہ کی شب میں ہر گل مہتاب بن گیا ہے

اور سچے موتیوں کے خوشے بھی اس نے بالوں میں لٹکائے تھے۔ کیونکہ ایک دفعہ تم نے کہا تھا:۔ "زیبا! موتیوں کے خوشے تمہارے بالوں میں جھولتے ہوئے کیا ہی پیارے لگتے ہیں۔" اور وہی بنفشی رنگ کا جوڑا پہنا تھا۔ جسے تم نے اودی اودی گھٹا سے تشبیہہ دی تھی۔ اودی اودی گھٹا جس نے چاند کو اپنی آغوش میں چھپا لیا ہو۔ پھر اچانک اس نے محسوس کیا کہ .... آہ اس نے محسوس کیا کہ تم نہ آسکو گے۔ اور اپنی مجبوری اور بے بسی کا احساس کر کے اس کی پلکیں موتیوں کی جھالریں بن گئیں۔ اور وہ اس طرح صوفے پہ گر پڑی جس طرح تند ہوا کے جھونکے سے پھول شاخ سے ٹوٹ کر خاک پہ گر پڑے۔"

قریب قریب ایسا ہی ایک وقت ہماری زندگی میں بھی آیا تھا اور گزر گیا تھا اور دل میں ایک مستقل چبھن، ایک ٹیس چھوڑ گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ خداوندا! آج اتنے زمانے کے بعد "نوشین" نے اس واقعہ کی یاد کیوں دلائی۔ اور وہ بھی جگ بیتی کے پردے میں۔ تمکنت کے آسمان سے یہ چاند خاک نشینوں کی بستی پر کیونکر اتر آیا؟ کیا نسوانی غرور ٹوٹ گیا؟ کیا محبت پھر کوئی معجزہ دکھانا چاہتی ہے؟ مگر یہ کیونکر ممکن ہے۔ "نوشین" نے تو ایک "بے وفا" کو بھول جانے کا عہد کیا تھا اور صاف لکھ دیا تھا کہ :۔

"نوشین اپنی پرانی خیالی دنیا سے رشتہ توڑ کر نیا روپ بدلے گی

اور ان تکلیف دہ یادوں کی پرچھائیں تک اپنے دل پہ نہ پڑنے دے گی۔"

پھر یہ ان "تکلیف دہ یادوں" کی یاد کیسی؟ پھر جی میں کہتا، انسان آخر انسان ہی تو ہے ؎

ہم "بے وفا" سہی، کبھی "محبوب" بھی تو تھے

اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

تم ہی بتاؤ، کیسے بھلاتے ہیں یاد دوست
جب واقعات یاد دلاتے ہیں یاد دوست

تو ممکن ہے یہ افسانہ دیکھ کر اپنے واقعات یاد آ گئے ہوں۔ بس یہ رسالہ اُٹھا کر بھیج دیا۔ غرض خیالات کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ جذبات میں ایک عجیب ہیجانی کیفیت برپا تھی۔ ٹہل تو رہا ہی تھا۔ بلا ارادہ سنگار میز کے سامنے جا کر کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایک فاتحانہ انداز کی مسکراہٹ۔ مجھے اپنی یہ پیشین گوئی یاد آ رہی تھی:۔

بیکار ہیں یہ ترکِ محبت کی کوششیں
ہم اور یاد آئیں گے جتنا بھلاؤ گی

اور پھر اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی نہایت حزیں آواز میں گا رہا ہے۔ بہت دور سے آواز آ رہی ہے۔ سوز میں جلتی ہوئی۔ درد میں ڈوبی ہوئی:۔

بھولی ہوئی دُنیا سے کوئی، رہ رہ کر، یاد آتا ہے
اپنی حالت کیا بتلاؤں، جی ہے کہ بیٹھا جاتا ہے
میں اُن کو بھولا ہی کب تھا، نفس کا یہ بھی دھوکا تھا
سچ مچ جن کو بھول گئے ہوں، کیا وہ یوں نہیں یاد آتا ہے

اور بے اختیارانہ بالکل غیر شعوری طور پر میں خود ہی ان اشعار کو گنگنانے لگا گنگناتا رہا۔ کتنی ہی دیر تک گنگناتا رہا۔ بالآخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو ماضی کی یادنے پھر محبت کی ان چنگاریوں کو ہوا دی ہے جو بھول کی راکھ میں دبی پڑی تھیں۔ خوشی سے دل کا عجب عالم تھا۔ بیتابی کے مارے ایک جگہ بیٹھا نہ جاتا تھا۔ کبھی کمرے میں، کبھی برآمدے میں، کبھی لان پر، گھبرایا گھبرایا ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ آخر قلم اور کاغذ اٹھا کر یہ شعر لکھا اور بھیج دیا۔

... ...

... ...

اور اس اعتماد کے ساتھ کہ جواب آئے گا اور ضرور آئے گا۔

پھر دماغ نے خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ کوئی ناممکن بات ایسی نہ تھی جو اس وقت ممکن نہ معلوم ہونے لگی ہو۔ خط کا انتظار، ہر روز انتظار، ہر وقت انتظار، جذبات میں سمندر کا سا مدوجزر۔ کبھی امید کی سنہری، روپہلی کرنیں دل کے چاروں طرف مسرتوں کا ایک جال سا بُن دیتیں اور ایسا محسوس ہوتا جیسے فضا میں ہر طرف

مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں تیرتی پھر رہی ہیں۔ اور کبھی یاس کی تاریکیوں میں دل ڈوبنے لگتا۔

جوں جوں خط کے آنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا خیال کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ خط اور خط کا پورا مضمون ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہنے لگا تھا۔ وہی خوبصورت نیلگوں لفافہ۔ اس کے اندر ایک اور لفافہ۔ اس کے اندر Ashes of Roses میں مہکتا ہوا خط۔ وہی چاندنی اور پھولوں کی روح میں سموئی ہوئی روحانی تحریر۔ وہی رنگینیاں، وہی لطافتیں، وہی نکہتیں۔ وہی جذبات کی حشر سامانیاں۔ وہی پیکرِ نازمیں روحِ نیاز۔ وہی والہانہ مگر حجاب آگیں سپردگی...... سوچتا، لکھا ہوگا:۔

"........! میری روح کی تسکین!"

اس اندازِ خطاب کے تصور ہی سے روح وجد کرنے لگتی۔ دل جھوم جاتا۔ سارے بدن میں ایک خفیف سی لرزش محسوس ہوتی۔ حواس پر ایک نشہ سا چھانے لگتا۔ دھیما دھیما غش سا آنے لگتا۔ خود بخود آنکھیں بند ہو جاتیں اور ایک خواب کا سا عالم طاری ہو جاتا۔ پھر خیال دو قدم آگے بڑھتا۔ ہاں تو لکھا ہوگا:۔

"........! میری روح کی تسکین! تم نے مجھے کیا کر دیا۔ ہائے میں دو دن بھی تو اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکی۔ کتنی بے بس ہوں میں اپنی اس دیوانگی کے ہاتھوں۔ اپنی خودداری، اپنے وقار، اپنی تمکنت، سب کو خاک میں ملا کر آج

پھر تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔"

اور خوشی سے میرا دل بے طرح اُچھلنے لگا۔ غرض میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اسی طرح گھنٹوں سوچتا رہا۔ اضطراب اور مسرت کے ملے جُلے جذبات میں وقت گزرتا گیا، گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ پہنچا جب ان کا جواب لازمی طور پہ آجانا چاہیئے تھا۔ اُفّوہ! صبح سے دن کے دس بجے تک پوسٹ مین کے انتظار میں کس بے چینی کے ساتھ وقت گزرا۔ کسی طرح دس بجتے ہی نہ تھے۔ کتنی مرتبہ گھڑی دیکھی۔ کتنی مرتبہ دھوپ دیکھی۔ کتنی مرتبہ باہر نکل کر سڑک پہ نظر ڈالی۔ خدا خدا کر کے ڈاکیا آیا۔ کتنے ہی خط لایا۔ مگر میری مسرتوں کا سرچشمہ ان میں نہ تھا۔ دل بہت ہی اداس ہوا۔

مگر سوچا کہ شاید فی الفور جواب لکھنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ کبھی ڈاک کے محکمے کی بدنظمی کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہا۔ کبھی اس تاخیر کے کچھ اور اسباب ٹھہرائے اس طرح ایک کے بعد دوسرا دن گزرتا گیا۔ اضطراب اور اضطراب کے ساتھ مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر نوشیں کا خط نہ آنا تھا نہ آیا۔ ساری حجتیں تمام ہو گئیں۔ کسی تاویل کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اب دل میں یاس ہی یاس تھی۔ مگر پھر بھی کسی گوشے میں امید کی ایک ننھی سی کرن باقی رہ گئی تھی جو مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھی چمک اُٹھتی تھی اور پھر ذرا سی آس بندھ جاتی تھی۔ مگر انسان کہاں تک اپنے کو فریب

دے سکتا ہے۔ پھر دل اسی طرح ویران، اسی طرح سنسان رہنے لگا جیسا پہلے تھا۔ بیٹھے بیٹھے جی بھر آتا، رونے لگتے۔ خود بخود اشعار موزوں ہونے لگتے:۔

یوں نامرادیوں میں گزرتے ہیں روز و شب
جب دل بھر آیا رونے لگے بیٹھ کر کہیں

کم ہوتی ہے نہ تڑپ دل کی، تھمتے ہیں نہ بہتے آنسو ہی
بجلی ہے کہ چمکے جاتی ہے، بادل ہیں کہ برسے جاتے ہیں

وہ ہم سے کنارہ کیوں نہ کریں، سچ ہے رسوائے عام ہیں ہم
اے کاش کوئی ان سے پوچھے، کیا بات ہے کیوں بدنام ہیں ہم

جلا کرنا نہ تھا اے بخت یوں آغازِ اُلفت میں
ہمیں مستوجبِ ہجراں تو ہو جانے دیا ہوتا

تیرے سوا کوئی حسیں، دل میں سما سکتا نہیں
جویائے نکہت کے لئے تصویرِ گل بے کار ہے

رفیق میرا دوست ہے، عزیز ہے، ہمراز ہے۔ ایک دن جب دل بہت بیقرار ہوا تو یہ سلوی داستان میں نے اسے لکھ بھیجی اور کہا کہ خدارا بتاؤ۔ یہ کیا معمّا ہے۔ آخر انھوں نے اس طرح میرے زخموں پر نمک کیوں چھڑکا؟ رسالہ کیوں بھیجا؟ اور اس ٹکڑے پر نشان کیوں کیا؟ آخر مقصود کیا تھا؟ کیا صرف آزار دینا؟ اگر نہیں تو پھر یہ خاموشی کیسی؟ جواب کیوں نہیں آیا۔

رفیق نے لکھا۔

"تم تو پاگل ہو۔ جواب کبھی نہ آئیگا۔ کسی وقتی جذبے کے ماتحت وہ رسالہ بھیج دیا ہوگا اور بس۔ تعجب ہے تم انسانی فطرت کے نبّاض ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور نسوانی فطرت کے اس راز کو نہ سمجھ سکے۔ حسن کی فطرت ہی غرور۔ اور پھر جس نے ترکِ تعلق کی قسم کھائی ہو اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ پھر ایک بار تمہیں یاد کرے۔ تم آگ سے ٹھنڈک اور برف سے حرارت مانگتے ہو۔ کہا مانو میرا کہ تم پاگل ہو۔ بھول جاؤ اور ہمیشہ کیلئے بھول جاؤ اس رنگین خواب کو"

عقل کی بات تو یہی ہے جو رفیق نے کہی مگر انھیں بھول جانا کیا میرے اختیار کی بات ہے ے

یہ کیا کروں آہ، بھلایا نہیں جاتا مجھ سے

وہی پیمانِ محبت جو انھیں یاد نہیں ؎

سچی کہانی

فاؤنٹن پین

مرزا غالب نے کہا تھا:-

سیکھیں ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

غالباً مرزا صاحب کے زمانے میں مصوّری مہ رخوں تک رسائی کا ایک اچھا ذریعہ تھی۔ مگر ہم نے تو اپنے زمانے میں نہ صرف مہ رخوں سے بلکہ ہر کہ و مہ سے رسم و راہ پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ پامسٹری کو پایا۔ چنانچہ تفننِ طبع کی خاطر پامسٹری سیکھی اور دل لگا کے سیکھی کتابوں سے بھی استفادہ کیا اور اس فن کے ماہروں سے بھی۔ پامسٹری کے احکام کی صداقت کا یقین نہ کبھی پہلے تھا نہ اب ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جسے جو کچھ بتا دیا وہ اکثر درست نکلا۔ اس فن کی معجز نمائی کا سب سے پہلا یادگار تجربہ لندن

میں ہوا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۳ء کا ہے۔

آغازِ بہار کی خوش گوار راتیں تھیں۔ اپنی لینڈ لیڈی کے ہمراہ پہلی بار "لوکارنو" ڈانس ہال میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈانس ہال نہ تھا۔ رنگ و نور کا ایک دریا تھا کہ رہ رہ کر امنڈ رہا تھا۔ شگفتہ چہرے۔ شاداب جوانیاں۔ رنگین ملبوسات۔ مہکی ہوئی فضا۔ نغموں کا طوفان اور مغرب کی مکمل آزادی۔ رقص کرنے والوں کا تو ذکر ہی کیا۔ جوشِ بساط سے تماشائیوں کے دل بھی آہنگ کے ساتھ ساتھ رقص کر رہے تھے۔ رو حوں پر وجد و حال کا عالم طاری تھا۔

نشستیں سب بھر چکی تھیں۔ آنیوالے اب بھی آرہے تھے۔ جسے جہاں موقع ملتا، کھڑا ہو جاتا۔ مگر اس طرح کہ دوسروں کے لطفِ نظر میں خلل انداز نہ ہو۔ ڈانس ہو رہا تھا۔ کہ کسی نے پیچھے سے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا:۔

"یہ لڑکی جو سیاہ ٹوپی پہنے آپ کے برابر والی میز پر بیٹھی ہے۔ للّٰہ کسی طرح اس کا نام اور پتہ معلوم کیجئے۔ وورا"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا چند قدم کے فاصلے پر مسٹر ہنسراج وورا کھڑے تھے۔ کچھ گھبرائے ہوئے سے۔ کچھ کھوئے ہوئے سے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو کچھ شرمائے۔ پھر مسکرائے۔ چند کلمے مسٹر وورا کے متعلق بھی سُن لیجئے کہ ان کی شخصیت بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

غالباً آپ نے سُنا ہو گا ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ نوجوان انارکسٹوں کی ایک پارٹی نے لاہور کے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سانڈرس کو قتل کیا تھا۔ مسٹر وورا بھی اس قتل میں شریک تھے۔ مگر بالآخر سلطانی گواہ بن کر چھوٹ گئے۔ گورنمنٹ نے اس خوف سے کہ کہیں ان کے ساتھی غدّاری کے جرم میں انہیں قتل نہ کر دیں۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انہیں لندن بھیج دیا۔ ایک امتحان کی ضرورت سے لندن میں انہوں نے مجھ سے فارسی پڑھی۔ قدرتاً ربط و ضبط بڑھ گیا۔ میں نے اُنہیں ایک شریف الطبع اور مخلص دوست پایا۔

ہاں تو مسٹر ہنسراج وورا کا پرزہ پا کر میں نے اپنے برابر والی میز پر نظر ڈالی۔ دو لڑکیاں اس کے کنارے بیٹھی تھیں۔ جو مجھ سے قریب تھی۔ وہ خاصی بدصورت تھی۔ اور دوسری سیاہ ٹوپی والی جو دُور تھی اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسی دلربا صورتیں زندگی میں کم ہی دیکھی ہیں۔ ہنستی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ چاندنی اور پھول فضا میں بکھر گئے ہیں۔ لباس نہایت سادہ۔ کانوں میں غالباً مرجان کے بڑے بڑے سُرخ حلقے۔ جیسے جپسی لوگ پہنتے ہیں۔ اور داہنے ہاتھ میں کہنی سے کچھ اوپر سونے کا کڑا۔ نوجوان وورا کی وارفتگی کچھ بے جا نہ تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیونکر مخاطب کروں۔ تعارف کے بغیر کسی اجنبی سے گفتگو کا وہاں دستور نہیں۔ مگر میں نے اس آئین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے برابر والی بدصورت لڑکی سے کہا۔

You have got a wonderful hand- عجیب غریب ہاتھ ہے آپ کا۔

کسی قدر ہچکچاہٹ اور تعجب کے ساتھ اُس نے کہا:۔

"میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب"

میں نے کہا میں پامسٹ ہوں۔ اتفاقاً آپ کے ہاتھ پر نظر پڑ گئی۔ ایسا ہاتھ میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ سُن رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور کہا:۔

"تو پھر اچھی طرح دیکھئے اور میری قسمت کا حال مجھے بتائیے۔ دراصل مجھے اس کا ہاتھ دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے یونہی ایک سرسری نظر ڈالی اور ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

"زیادہ سے زیادہ تین برس کے اندر آپ کو کہیں سے کثیر دولت ملے گی۔ مستقبل آپکا نہایت روشن ہے۔ عیش ہی عیش قسمت میں لکھا ہے" اسی طرح کی اور بھی کئی خوش آئند باتیں کیں۔ فرط مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اُسکی سہیلی بھی ان پیشین گوئیوں کو بڑے غور سے سُن رہی تھی۔ وہ بھی اپنا ہاتھ دکھانے کے لئے بیتاب تھی۔ جب میں کہہ چکا تو اُس نے اپنی سہیلی سے جگہ بدلی اور کہا "مہربانی فرما کر ذرا میرا ہاتھ بھی دیکھئے"

میں نے اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور کہا:۔

"کوئی غیر معمولی بات آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ کوئی خاص سوال کیجئے تو اس کا جواب دوں"

وہ افسردہ ہو گئی اور مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"اچھا تو میرے روزگار کے متعلق کچھ بتلائیے۔"

میں نے پھر اس کا ہاتھ بہ غور دیکھا اور کہا۔

"آپ کی موجودہ ملازمت ہی آپ کو جلد ترقی کے راستے پر ڈال دیگی۔"

اُسنے متعجب ہو کر کہا،

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ موجودہ ملازمت کیسی؟ میں تو ایک مدت سے بیکار ہوں۔"

میں کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ پھر اس کا ہاتھ بغور دیکھا اور کہا:

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ماجرا ہے۔ آپ کے ہاتھ کی لکیریں تو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ایک معقول ملازمت آپ کو ملی ہوئی ہے۔ اور آپ کہتی ہیں کہ ایک مدت سے بیکار ہوں۔ تو پھر اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ شاید آج کل ہی میں کوئی اچھا کام آپ کو مل جائے گا۔ بہت ممکن ہے کہ آج رات کو جس وقت آپ گھر پہنچیں تو تقرر کا پروانہ سرہانے رکھا ہوا ملے۔

وہ مسرور ہو گئی اور مسکرا کر بولی:

"آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں آپکی بہت ہی شکر گزار ہوں۔ خدا کرے آپکی پیشین گوئی سچی ثابت ہو۔" میں نے کہا انشاءاللہ ایسا ہی ہو گا۔ پھر میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے کہا Betty پھر پتہ دریافت کیا۔ وہ ذرا خاموش ہوئی۔ پھر کہا۔ قلم اور کاغذ ہو تو لائیے۔ لکھ دوں۔ میں نے بٹوے میں سے نکال کر وزٹنگ کارڈ دیا۔ اس نے

سوچ سوچ کر لکھنا شروع کیا۔ مجھے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔

ڈانس ختم ہونے سے پہلے ہی دونوں لڑکیاں خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوئیں مسٹر سراج دورا میرے پاس آ بیٹھے۔ نام اور پتہ دیکھ کر بیحد مسرور ہوئے۔ دوسرے ہی دن اس غزالِ رعنا کی تلاش میں نکلے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ وہ فتنہ کا فریب دے گئی۔ اُس محلے میں اس نمبر کا کوئی مکان تھا ہی نہیں۔ دورا مدتوں اس کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ بارہا "لوکارنو" گئے۔ مگر پھر کبھی اُسے نہ دیکھا۔ آخر مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔

جس روز میں ہندوستان روانہ ہونے والا تھا۔ اُس سے ایک دن پہلے میرے دوست مسٹر ابوالحسن قریشی آئی۔ سی۔ ایس۔ جو لندن میں میرے ساتھ رہتے تھے اور آج کل بنگال سکریٹریٹ میں ہیں، اصرار کر کے مجھے اپنے ہمراہ "لوکارنو" لے گئے۔ ہم تھوڑی ہی دیر بیٹھے تھے۔ کہ میرا دل گھبرانے لگا۔ دراصل لندن سے جی اچاٹ ہو چکا تھا۔ اور سفر سر پر سوار تھا۔ میں نے کہا۔ قریشی اب گھر چلو۔ دل گھبرا رہا ہے۔ ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے میرا اوور کوٹ مجھے پہنایا۔ اور ہم چل پڑے۔ وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے چند ہی قدم چلے تھے کہ اچانک ایک لڑکی پر میری نظر پڑی۔ بالکل اُسی آہوئے رم خوردہ کی سی صورت۔ میں نے قریشی سے کہا۔ ذرا ٹھہرو۔ مجھے ایک لڑکی پر کسی کا شبہ ہو رہا ہے انہوں نے کہا۔ بندۂ خدا۔ کل تو تم ہندوستان جا رہے ہو۔ اب ختم بھی کرو۔ اس قصے کو۔ بہر حال میں اس لڑکی کے قریب گیا۔ اور میں نے کہا۔

"مس! کیا آپ کا نام Betty "بیٹی" ہے؟" اس نے کہا۔ نہیں۔ میرا

نام "بیٹی" نہیں۔ میں نے کہا۔ عجب اتفاق ہے۔ ایک برس ہوا نہیں "لوکارنو" میں ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بالکل آپ کی صورت تھی۔ ایسی غیر معمولی مشابہت میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ جبھی تو مجھے آپ پر اس کا شبہ ہو گیا۔ وہ کانوں میں مرجان کے بڑے بڑے حلقے اور بازو میں سونے کا کڑا پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ بھی دیکھا تھا۔ اور اس کے روزگار کے متعلق پیشین گوئی بھی کی تھی۔

وہ بغور میری باتوں کو سن رہی تھی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں نے کہا۔ اچھا معاف کیجئے۔ میں نے ناحق آپ کو زحمت دی۔ خدا حافظ۔ میں دو ہی قدم گیا تھا کہ اس نے آواز دی: "مگر سنئے تو" میں پلٹا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں ہی Betty "بیٹی" ہوں۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ اس دن میں نے آپ کو اپنا نام اور پتہ بالکل غلط بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید آپ مجھ سے رسم وراہ پیدا کرنا چاہتے ہیں بعض وجوہ سے میں اس کے لئے تیار نہ تھی بس غلط نام اور غلط پتہ بتا دیا۔ گھر پہنچی تو ملازمت کا پروانہ ملا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی ساتھ ہی بے حد افسوس اور ندامت بھی کہ میں نے آپ کے ساتھ نازیبا سلوک کیا۔ بارہا "لوکارنو" آئی مگر کبھی آپ کو نہ دیکھا۔ دل چاہتا تھا کہ آپ سے ملوں معذرت چاہوں اور آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آج اتفاقاً آپ سے ملنا ہو گیا۔ اور اس وقت جو میں نے کہا کہ میں "بیٹی" نہیں ہوں۔ تو یہ بھی ٹھیک ہی تھا۔ کیونکہ دراصل میرا نام "جوئس" ہے سال بھر کے بعد اچانک جو آپ کو دیکھا تو پہچان نہ سکی۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف

—

کر دیں گے۔ یہاں لندن میں بہت سے پامسٹ ہیں۔ اُن میں سے کئی کو میں نے اپنا ہاتھ دکھایا، مگر کبھی کسی نے کوئی کام کی بات نہ بتائی۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا میں تو قائل ہوگئی آپ کی ہندوستانی پامسٹری کی۔"

اس قسم کے تجربے زندگی میں بارہا ہوئے اور بعض پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح نکلیں۔ مگر اُن واقعات کو دہرا کر میں آپ پر رعب ڈالنا۔ یا اپنا معتقد بنانا نہیں چاہتا صرف ایک واقعہ اور سناؤں گا اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ ڈھاکے میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب مرحوم پرنسپل طبیہ حبیبہ کالج کے یہاں دعوت میں ایک صاحب سے تعارف ہوا۔ شہر عزیز الحق اُن کا نام تھا۔ ضلع ندیا کے صدر مقام "کرشناگر" میں وکالت کرتے تھے۔ باتوں باتوں میں پامسٹری کا ذکر آگیا۔ میں نے اُن کا ہاتھ دیکھا اور کہا۔

"بہت جلد آپ کسی بلند مرتبے پر پہنچنے والے ہیں۔ شہرت، عزت، دولت سب ایک ساتھ آئیں گی۔"

انہوں نے پوچھا۔ وہ کس طرح۔ میں نے کہا۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کام کی لائن بالکل بدل جائے گی۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ یہ تو کسی حد تک ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بی۔ اے میں سنسکرت لی تھی۔ اور سنسکرت سے مجھے خاص دلچسپی ہے۔ کچھ ادبی کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ سنسکرت کی بعض کتابوں کو ایڈٹ کروں۔ مگر دولت اس کام میں کہاں۔ ہاں یہ ممکن ہے کچھ

شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے کہا: "اب یہ تو میں جانتا نہیں کہ کیا ہوگا۔ اور کیونکر ہوگا۔ مگر آپ کے ہاتھ کی لکیریں یہی کہتی ہیں کہ جلد آپ ایک بڑے آدمی بننے والے ہیں۔" وہ بہت مسرور ہوئے۔ دوسرے دن وہ ڈھاکا سے چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد اخبار میں دیکھا کہ کوئی صاحب مسٹر عزیز الحق نام بنگال کے وزیر تعلیم مقرر کئے گئے۔ معلوم ہوا۔ یہ وہی مسٹر عزیز الحق ہیں جن کا ہاتھ میں نے دیکھا تھا۔

کچھ زمانہ کے بعد وہ پھر ڈھاکا تشریف لائے۔ پھر حکیم صاحب مرحوم کے یہاں دعوت میں اُن سے ملنا ہوا۔ انہوں نے کہا: "آپ کی پیشینگوئی واقعی سچ نکلی۔ مگر ایک بات تو بتایئے۔ نئی منسٹری بننے والی ہے۔ کیا اس نئی منسٹری میں بھی یہ عہدہ مجھی کو ملیگا" میں نے اچھی طرح اُن کے ہاتھ کا مطالعہ کیا اور کہا: "یہ تو میں نہیں جانتا کہ کونسا عہدہ آپ کو ملے گا۔ مگر اس قدر یقینی ہے کہ آپ کا پوزیشن برقرار رہے گا اور اعزاز برابر بڑھتا جائے گا۔"

دوسری منسٹری جب بنی تو مسٹر عزیز الحق بنگال لیجسلیٹو اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہوئے پھر "سر" کا خطاب ملا۔ پھر لندن میں ہندوستان کے ہائی کمشنر رہے اور انٹیرم گورنمنٹ بننے سے پہلے وائسرائے کی کونسل کے کامرس ممبر تھے۔

تمہید طویل ہو گئی۔ مگر اس پس منظر کے بغیر آپ اس واقعے سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

ہماری یونیورسٹی میں گرمیوں کی تعطیل شروع ہو چکی تھی۔ ڈھاکا سے کلکتہ تک کے سفر کی تھوڑی سی تفصیل بیان کر دینا ضروری ہے۔ ڈھاکا سے نرائن گنج تک دس میل ریل کا سفر۔ نرائن گنج سے گوالندو تک ایک سو چار میل جہاز کا سفر اور گوالندو سے کلکتہ تک ۱۵۵ میل پھر ریل۔ دوپہر کو ڈھاکا سے روانہ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے دن علی الصباح کلکتہ پہنچتے ہیں۔ یہ گاڑی اگر چھوٹ جائے تو پھر دوسرے دن اسی وقت ملتی ہے۔ البتہ ایک چکر کا راستہ اور بھی ہے۔ دن کے ساڑھے تین بجے ڈھاکا سے چلتے ہیں پھر نرائن گنج سے چاندپور تک جہاز کا سفر۔ رات بھر جہاز چاندپور میں ٹھہرا رہتا ہے اور صبح کے ۴ بجے گوالندو روانہ ہوتا ہے۔

دوپہر کی گاڑی مجھے نہ مل سکی میں نے سوچا ۲۴ گھنٹے ڈھاکا میں پڑے رہنے سے بہتر یہی ہے کہ سفر میں وقت کٹے۔ چنانچہ میں اسی دن تیسرے پہر کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ ایسے کئی اور مسافر بھی جہاز میں تھے جو اس پیچ دار راستے سے کلکتہ جا رہے تھے۔ شام کو ۷ بجے جہاز چاندپور پہنچا۔ چاندپور اور چاٹگام کے مسافر یہاں اتر گئے۔ کلکتہ جانے والے جہاز ہی میں رہے۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ڈائننگ روم میں بیٹھے گپ کر رہے تھے۔ روحانی علوم کا ذکر چھڑا۔ ایک صاحب میرے شناسا تھے۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پروفیسر صاحب بڑے اچھے پامسٹ ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ ہر شخص اپنا ہاتھ دکھانے کا آرزومند ہو گیا۔

ایک صاحب پولیس کے انسپکٹر تھے کسی مقدمے میں پھنس گئے تھے۔ آج کل معطل تھے۔ پہلے میں نے ان کا ہاتھ دیکھا اور کہا "آپ صاف چھوٹ جائیں گے۔"

دوسرے صاحب منصف تھے۔ ابھی مستقل نہیں ہوئے تھے۔ محکمہ کا امتحان دینے کلکتہ جا رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ دیکھ کر میں نے کہا: "آپ کی کامیابی یقینی ہے۔" ایک صاحب جو نہایت اپٹوڈیٹ سوٹ پہنے میرے مقابل آرام کرسی پر بیٹھے بڑی تمکنت سے سگار پی رہے تھے۔ یہ باتیں سُن کر طنز کے ساتھ بولے۔

"سنا تھا کہ غیب کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں۔ آج معلوم ہوا کہ جناب کو بھی اس میں خاصہ دخل ہے۔"

میں نے کہا "عالم الغیب تو صرف خدا کی ذات ہے۔ اور نجوم، رمل جفر، پامسٹری یہ سب علوم ظنّی اور قیاسی ہیں یقینی نہیں۔ نہ ان کے تمام احکام ہمیشہ صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ پھر بھی اکثر باتیں ٹھیک نکلتی ہیں۔"

انہوں نے ایک حقارت آمیز تبسّم کے ساتھ فرمایا۔

"سب خرافات ہے۔"

مجھے اُن کی یہ بات بہت ناگوار گذری۔ میں نے کہا:

"آزمائش شرط ہے۔ ہمّت ہو تو ہاتھ دکھایئے۔ ابھی سارا کچّا چٹھا کھول کر نہ رکھ دوں تو بات نہیں۔"

انہوں نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پوری توجہ کے

ساتھ اُن کے ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ شروع کیا۔ ہر شخص نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اور بے چینی کے ساتھ پیشین گوئی کا منتظر تھا میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ فاتحانہ انداز میں کہا:

"ماشاء اللہ بڑی رنگین طبیعت پائی ہے آپ نے۔ شادی ہو چکی ہے، بیوی بچے موجود ہیں۔ پھر بھی جناب نے ایک تازہ رومان کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور ایک دوشیزہ سے محبت کے پینگ بڑھائے جا رہے ہیں"

میری باتیں سن کر وہ کچھ بدحواس سے ہو گئے۔ چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولے۔

"محض خرافات۔ بندہ نواز میری شادی محبت کی شادی ہے۔ زندگی کا یہی ایک رومان ہے اور بس۔ آپ کچھ اور فرماتے تو شاید مجھے چنداں تعجب نہ ہوتا۔ مگر آپ نے تو ایسی بے تکی بات کہی جس کا نہ سر ہے نہ پیر"

میں نے کہا "معاف فرمائیے ممکن ہے میں نے غلط ہی کہا ہو۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ آپ کے ہاتھ کی لکیریں یہی کہتی ہیں"

لوگوں نے نہایت معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور یہ صاحب کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ بات ختم ہو گئی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں اپنی کیبن میں گیا اور تکیہ پر سر رکھتے ہی بے خبر سو گیا۔ سویا اور خوب سویا۔ علی الصباح آنکھ کھلی۔ جہاز چاندپور سے روانہ ہو چکا تھا۔ اچانک میری کیبن کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا میں

نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دیکھا تو وہی صاحب شاندار سوٹ والے کیبن میں داخل ہوئے انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور بولے۔ ؟"

کہا: "آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں سخت شرمندہ ہوں کہ رات میں نے آپ کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا۔ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے خود جھوٹ بول کر دوسروں کی نظر میں آپ کو جھوٹا ثابت کرنا چاہا۔ پروفیسر صاحب! برائے خدا مجھے معاف کر دیجیے۔"

میں نے کہا: "بار بار معذرت چاہ کر آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے باور فرمائیے۔ مجھے رات کی بات کا اب کوئی ملال نہیں۔" انہوں نے کہا۔ واللہ پروفیسر صاحب! آپ تو عجائبات روزگار میں سے ہیں۔ آپ کو ولی اللہ کہوں قطب کہوں۔ غوث کہوں۔ کیا کہوں۔ وہ راز جو ہمارے دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے اور ہم دونوں کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں جانتا۔ آپ نے اس طرح معلوم کر لیا۔ جیسے آپ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر للہ! اتنا اور بتا دیجئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔"

میں نے کہا: "آپ نے میرے متعلق جو کچھ فرمایا یہ آپ کا حسنِ گمان ہے۔ رہا انجام کا سوال تو پہلے مجھے واقعات کی کچھ تفصیل بتائیے۔ اس سے مجھے مدد ملے گی۔ شاید میں آپ کے مستقبل کے متعلق کوئی صحیح حکم لگا سکوں۔ پہلے یہ بتائیے کہ وہ فتنہ گر ہے کون جو آپ کی ہمدمانی شادی کے آہنی حصار کو توڑ کر آپ کے دل میں در آئی۔ اور اُس کے مالک کو بے دخل کر کے خود اس پر قابض و متصرف ہو گئی۔"

کہنے لگے۔ وہ میری چھوٹی سالی ہے میں اُسے شگوفہ کہتا ہوں ..... پروفیسر صاحب میں تباہ ہوگیا۔ شگوفہ کے بغیر زندگی تلخ ہے اور اُسے پالینے کی کوئی صورت نہیں پھر قیامت یہ کہ اُسے بھی مجھ سے بے انتہا محبت ہے۔ مگر وہ کہتی ہے کہ گھٹ گھٹ کے مرجانا قبول ہے مگر یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ میری بدولت بہن کا گھر برباد ہو جائے۔"

میں نے پھر اُن کا ہاتھ دیکھا۔ ایک ایک لکیر پر اچھی طرح غور کیا اور کہا کہ "اس محبت کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں جس قدر جلد آپ اس سے دست کش ہو جائیں آپ کے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ شگوفہ کی بے وفائی کا داغ آپ کو اٹھانا پڑے گا۔ اور اس وقت دل کا یہ زخم ناسور بن جائے تو عجیب نہیں۔" وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔

پھر میں نے کہا: "اور ہاں۔ آپ کا نام مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کچھ اپنا حال تو بتایئے۔ انہوں نے کہا:

"خاکسار کو عبدالماجد کہتے ہیں۔ اصلی وطن تو دہلی ہے۔ مگر کاروبار کے سلسلے میں ہم لوگ زمانہ دراز سے مستقل طور پر کلکتہ میں مقیم ہیں۔"

ناشتے کا وقت ہو چکا تھا ہم لوگوں نے ناشتا کیا۔ اور اس کے بعد کلکتہ تک وہ شگوفہ ہی کی باتیں کرتے چلے گئے۔ کلکتہ سے وہ مجھے کبھی کبھی خط بھی لکھا کرتے تھے شگوفہ کا قیام دہلی میں تھا عبدالماجد صاحب کبھی بیوی کو میکے پہنچاتے کبھی واپس لاتے کبھی کسی اور بہانے جلد جلد دہلی جاتے رہتے تھے۔ اصل مقصود شگوفہ کا دیدار تھا۔ میری ان کی ملاقات کو تقریباً ۱۴ مہینے گذر چکے تھے۔

گرمیوں کی تعطیل ختم کر کے میں رامپور سے علی گڑھ ہوتا ہوا ڈھاکا واپس آ رہا تھا علی گڑھ سے میں جس درجے میں سوار ہوا اس میں کئی مسافر تھے۔ مگر وہ سب وہیں اتر گئے میں تنہا رہ گیا۔ مگر جیسے ہی گاڑی نے سیٹی دی۔ ایک نوجوان اس درجے میں آ داخل ہوا گاڑی چل پڑی۔ ہندوستانی قاعدے کے مطابق ہم جلد ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ ان صاحبزادے کا نام عارف تھا۔ الہ آباد کے باشندے۔ ایک خوشحال باپ کے بیٹے۔ اسی سال لکھنؤ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری پاس کر کے دہلی میں پریکٹس شروع کی تھی۔ چند روز کے لئے گھر (الہ آباد) جا رہے تھے کسی دوست سے ملنے ایک دن کے لئے علی گڑھ ٹھیر گئے تھے۔ تندرستی۔ جوانی۔ خوش حالی۔ اعلیٰ تعلیم، اور مہذب ماحول سب نے مل کر عارف کو ایک نہایت جاذب توجہ انسان بنا دیا تھا۔ بہت جلد ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔

ٹونڈلہ جنکشن پر ریل ٹھہری تو میں یوں ہی گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ دیکھا مسٹر عبدالماجد کھڑکی سے سر نکالے پانی والے کو بلا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوئے۔ وہ دہلی سے واپس آ رہے تھے۔ فوراً ہی وہ اپنا اسباب اٹھوا ہمارے درجے میں آ گئے۔ میں نے ڈاکٹر عارف کو ان سے ملایا۔ گاڑی چل پڑی۔

ماجد صاحب سے میں نے شگوفہ کا حال پوچھا۔ وہ یکا یک بے حد افسردہ ہو گئے کئی منٹ تک خاموش رہے۔ پھر نہایت پست و حزیں آواز میں بولے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ بیوی کو بدگمانی پیدا ہو چکی ہے اور قیامت یہ کہ شگوفہ کی نگاہیں بدلی ہوئی پاتا ہوں۔ میری زندگی تلخ تر ہوتی جا رہی ہے۔"

اُن کی روداد غم سُن کر مجھے افسوس ہوا۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ گاڑی کانپور سے گذر چکی تھی۔ ماجد صاحب نے کہا۔ پروفیسر صاحب! کچھ اپنا تازہ کلام سنائیے مدت ہوئی کان ترس گئے۔ رُوح بھوکی ہے۔ ڈاکٹر عارف اگرچہ سائنس کے طالب علم تھے۔ مگر شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی اصرار کیا۔ میں نے اپنے متفرق اشعار پڑھنے شروع کئے۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

دیرینہ راز داں ہوں، لب ہائے نازنیں کا
میں خوب جانتا ہوں، مطلب نہیں نہیں کا

تو عارف صاحب جھوم گئے اور بولے: "سبحان اللہ! کیا نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے" ماجد صاحب نے کہا۔ اپنے خاص رنگ کا کوئی شعر سنائیے۔ میں نے یہ شعر پڑھا ؎

شکریہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے! یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

ماجد صاحب تڑپ اُٹھے۔ کہنے لگے: واللہ کیا بات کہی ہے۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ شعر آپ کا ہے۔ کچھ دن ہوئے دہلی کے رسالہ "طلوعِ اسلام" میں ایک سیاسی

مضمون چھپا تھا۔ مولینا ابوالکلام آزاد کا یہ قول نقل کر کے کہ

"مسلمان بنتا ہیں تو سہی آخر انہیں کانگریس سے شکایت کیا ہے۔"

مضمون نگار نے اپنا جواب اسی شعر سے شروع کیا تھا کہ :-

شکر یہ پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر

پوچھنے والے! یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

میں نے کہا تب تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ "شعر عاشقانہ مرا بہ معرکۂ سیاست کہ بُرد" (میرے عاشقانہ شعر کو سیاست کے معرکے میں کون لے گیا) اس پر ہم تینوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ پھر میں نے یہ شعر پڑھا :-

زخم دل کے چھپا رہا ہوں میں

کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

ماجد صاحب اور عارف صاحب دونوں نے بیک وقت کہا :

"واہ وا" پھر ماجد صاحب نے مجھ سے کہا : ذرا اپنا قلم عنایت فرمائیے۔ یہ شعر بھولے گا تو یوں بھی نہیں مگر احتیاطاً لکھ لوں تو اچھا ہے۔ میں نے اپنا قلم دیا۔ وہ لکھنے لگے معلوم ہوا قلم میں روشنائی ختم ہو چکی تھی۔ عارف صاحب نے فوراً جیب سے اپنا فاؤنٹین پن نکال کر پیش کیا۔ نہایت خوبصورت نیا اور قیمتی قلم۔ ماجد صاحب اُسے دیکھتے ہی ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے دیکھا لکھتے وقت ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ خیر جیسے تیسے اُنہوں نے وہ شعر لکھا اور قلم عارف صاحب کی طرف بڑھایا۔ اُن کے چہرے پر تاریکی

چھاگئی تھی۔ عارف صاحب دُور تھے۔ میں اُن سے قریب تھا۔ قلم اُن کے ہاتھ سے میں نے لے لیا۔ اور اُلٹ پلٹ کے اچھی طرح اُسے دیکھا۔ سنہری حروف میں اس پر "تسنیم" کندہ تھا۔ میں نے کہا عارف صاحب! قلم تو آپ کا واقعی بہت خوب ہے۔ کسی حسین کو نذر دینے کے قابل چیز ہے۔ وہ مسکرانے لگے۔ پاس ہی ٹائم ٹیبل پڑا تھا۔ اُٹھا کر میں نے اس پر کچھ لکھا۔ قلم بہت رواں چلتا تھا۔ میں نے کہا "واقعی تسنیم کی موجوں کی سی روانی ہے"۔ وہ بہت مسرور ہوئے اور بولے: "آپ کی ہر بات شعر ہے"۔

میں نے کہا آپ کا حسنِ ذوق اور حُسنِ انتخاب قابلِ داد ہے۔ انہوں نے کہا مگر یہ حسینِ ذوق یا حسنِ انتخاب میرا نہیں۔ مجھے تو یہ تحفہ ایک دوست نے دیا ہے۔ میں نے کہا:۔

"مستحق مبارکباد ہے وہ شخص جس کا دوست ایسا خوش ذوق ہو"۔ خوشی سے اُن کا چہرہ چمکنے لگا۔ ماجد صاحب بالکل ساکت وصامت بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے ماجد صاحب!" ماجد صاحب اپنے خیالات میں گم، دنیا ومافیہا سے بے خبر، کسی اور ہی عالم میں تھے۔ اپنا نام سُن کر چونک پڑے اور کہا: "جی ہاں، درست ہے"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی شدید قسم کے ذہنی خلفشار میں مبتلا ہیں۔ چند ہی منٹ میں وہ اچھے خاصے بیمار معلوم ہونے لگے تھے۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کہا: مجھے کچھ دنوں سے اختلاجِ قلب کی شکایت ہوگئی ہے

اچانک طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔ اس وقت کچھ عجیب کیفیت ہے۔ دل بیٹھا جا رہا ہے جسم سنسنا رہا ہے۔ میں نے کہا لیٹ جایئے۔ وہ لیٹ گئے۔ تھرماس کھول کر میں نے برف نکالی اور لیموں کا شربت بنا کر انہیں پلایا۔ میں اور عارف صاحب دونوں ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ بارے رفتہ رفتہ انہیں کچھ سکون ہوا۔

گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ فتح پور پہنچی تو خاصہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ کانپور سے ہمارے ڈبے میں جو مسافر سوار ہوئے تھے۔ وہ فتح پور میں اتر گئے اور ریلوے پولیس کے ایک سب انسپکٹر صاحب اس میں آ بیٹھے۔ بہت ہی معقول آدمی معلوم ہوتے تھے۔ عارف صاحب نے کہا: آج تو گرمی نے بدحواس کر دیا۔ سوچتا ہوں کہ نہا لوں تو ذرا طبیعت کو سکون ہو۔ میں نے کہا اچھی بات ہے۔ نہا لیجیے۔ وہ اپنا کوٹ اتار، کھونٹی پر لٹکا، غسل خانے میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی بیگم صاحبہ کو خط لکھنا شروع کیا۔ ارادہ تھا کہ الہ آباد میں پوسٹ کر دوں گا۔ ماجد صاحب اٹھے۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دو تین منٹ ٹہلے اور لیٹ گئے۔

عارف صاحب نہا کر نکلے۔ میں ہنوز خط لکھ رہا تھا۔ انہوں نے حیرت اور گھبراہٹ کے ساتھ چلا کر کہا:

"ارے! میرا قلم کیا ہوا؟"

میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہے تھے۔ جیب سے ان کا قلم غائب ہو چکا تھا۔ میں بھی سخت حیران تھا۔ ماجد صاحب اپنی سیٹ پر خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک ان کی قمیص کی جیب پر عارف صاحب کی نظر پڑ گئی۔ قلم وہاں

موجود تھا۔ عارف صاحب خوش ہو کر بولے :۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں خواہ مخواہ بدحواس ہو گیا تھا۔ قلم ماجد صاحب کے پاس ہے۔ ماجد صاحب اب بھی کچھ نہ بولے۔ عارف صاحب کا خیال تھا کہ غالباً ماجد صاحب نے کچھ لکھنے کو قلم ان کی جیب سے نکالا ہوگا، پھر رکھنا بھول گئے۔ ماجد صاحب اس طرح خاموش لیٹے تھے جیسے اِن باتوں سے اُنہیں کوئی علاقہ ہی نہیں۔

عارف کو حیرت ہوئی۔ مجھے بھی تعجب تھا۔ عارف نے ماجد صاحب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ قلم کے لئے" یہ خاموش مطالبہ تھا۔ ماجد صاحب نے اب بھی کوئی اعتنا نہ کی۔ عارف کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا : قلم عنایت ہو۔ ماجد صاحب نے کہا : کیسا قلم؟ عارف نے ذرا تلخ لہجے میں کہا، کیسا قلم! یہی قلم جو آپ کی جیب میں ہے۔

ماجد صاحب جھنجلا کر بولے :" کچھ دماغ خراب ہوا ہے آپ کا؟ یہ تو میرا قلم ہے" عارف کو غصہ آگیا۔ اُس نے کہا" میرا دماغ تو خراب نہیں ہوا، مگر آپ ضرور پاگل ہو گئے ہیں" یہ کہا اور بڑھ کر ماجد صاحب کی جیب سے قلم نکالنا چاہا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں سخت حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اب تو مجھے بھی شبہ ہونے لگا کہ شاید ماجد صاحب پر جنون کا دورہ پڑا ہے میں نے بہ زور دونوں کو علیحدہ کیا۔ قلم ماجد صاحب ہی کے قبضے میں رہا۔ عارف نے مجھ سے کہا!" دیکھتے ہیں آپ ان کی دیوانگی"۔ ماجد صاحب گرج کر بولے :" خاموش! ایک لفظ زبان سے نکالا تو بھیجا پاش پاش کر دونگا"۔ عارف تندرست اور جوان تھا۔ آگ بگولا ہو گیا۔ اور غضبناک شیر کی طرح ماجد صاحب پر جھپٹا

میں پھر درمیان میں آگیا۔ سب انسپکٹر نے عارف کا ہاتھ پکڑ لیا۔ غرض ہم دونوں نے مشکل سے عارف کو روکا۔

سب انسپکٹر نے کہا: "آپ دونوں صاحب ماشاءاللہ معزز اور تعلیم یافتہ ہیں۔ آخر جھگڑا کس بات پر ہے؟ یہ ہنگامہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

عارف نے کہا: "ارے صاحب جھگڑا کیا! میں ابھی آپ کے سامنے غسل خانے میں گیا تھا۔ ان حضرت نے جیب سے میرا قلم نکال لیا اور فرماتے ہیں کہ میرا قلم ہے۔" سب انسپکٹر بھی سخت حیران تھا۔ عارف صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو پروفیسر صاحب سے پوچھ لیجئے۔" سب انسپکٹر نے مجھ سے کہا: "یہ کیا قصہ ہے پروفیسر صاحب!"

میں نے کہا: "کیا بتاؤں صاحب! میری سمجھ میں خود کوئی بات نہیں آتی پہلی بار میں نے یہ قلم عارف صاحب ہی کے پاس دیکھا تھا۔"

سب انسپکٹر اور بھی حیران ہوا۔ ماجد صاحب کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سب انسپکٹر نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ دے کیوں نہیں دیتے ان کا قلم۔ خواہ مخواہ بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔"

ماجد صاحب نے کہا: "میں پوچھتا ہوں کہ آپ کو دخل در معقولات کا حق کس نے دیا ہے؟ آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ قلم میرا نہیں کسی اور کا ہے۔"

"اور آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ قلم آپ کا ہے۔" سب انسپکٹر نے ذرا بھی

کے ساتھ کہا:۔

ثبوت کی ضرورت ہو گی تو ثبوت بھی پیش کر دیا جائے گا۔ ذرا ان صاحبزادے سے یہ تو پوچھئے کہ ان کے پاس یہ قلم آیا کہاں سے"؟

عارف نے کہا: "آپ پوچھنے والے کون!

سب انسپکٹر نے کہا: "مگر آپ بتا دیں تو حرج بھی کیا ہے!"

"میرے ایک عزیز دوست نے تحفے میں دیا ہے" عارف نے جواب دیا۔

"کون ہیں وہ آپ کے عزیز دوست۔ ان کا نام۔ پتہ۔ کچھ تو فرمایئے" ماجد صاحب نے درشتی سے پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا" عارف نے سختی سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں بتا سکتے۔ آپ سچے ہیں تو بتایئے نا" ماجد صاحب نے پھر طنز سے کہا۔

"کسی کے پرائیویٹ معاملات جاننے کا آپ کو کوئی حق نہیں" عارف نے پھر اسی طرح جواب دیا۔

"دیکھا انسپکٹر صاحب آپ نے" ماجد صاحب ایک فاتحانہ انداز سے بولے۔

میں بھی حیران تھا سب انسپکٹر بھی حیران تھا۔ معمہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ عارف اب غصے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے انتہائی برہمی

اور جوش کے ساتھ کہا:

"ماجد صاحب قلم دے دیجئے نہیں تو خون ہو جائے گا" وہ زخمی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ماجد صاحب نے تلخی حقارت اور طنز کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔

"بہت دیکھے ہیں خون کرنے والے"

عارف کے تیور کہہ رہے تھے کہ بس اب وہ حملہ کیا ہی چاہتا ہے۔ تجربہ کار سب انسپکٹر نے عارف کے ارادے کو بھانپ لیا۔ اور اس نے ایک تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"دیکھئے صاحب: آپ شریف لوگ ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ آپس میں فیصلہ کر لیں ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ٹرین اس وقت میرے حلقے میں جا رہی ہے۔ اگلے اسٹیشن پر میں آپ دونوں کو پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں گا۔ بلکہ ممکن ہے ابھی زنجیر کھینچ کر مجھے گاڑی کو روکنا پڑے۔ مقدمہ عدالت میں جائے گا تو آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ دونوں پارٹیوں کو کس قدر ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اچھا ماجد صاحب آپ عمر میں بڑے ہیں میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ اِس قضیہ کو ختم کر دیجئے۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ کے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ قلم آپ کا ہے۔ آپ وہ ثبوت پیش کر دیں تو قصہ ابھی ختم ہو جائے۔

ماجد صاحب نے کچھ کہے بغیر اپنا اٹیچی کیس کھولا۔ اس میں سے ایک کاغذ نکالا اور سب انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ یہ کیش میمو (رسید) تھا۔ قلم کی پوری تفصیل اور قیمت اس میں درج تھی۔ کناٹ پلیس کی کسی دوکان سے اسّی رُپے میں خریدا گیا تھا۔ اس ثبوت

کی موجودگی میں قلم کی ملکیت کے متعلق عارف صاحب کے تمام دعوے بلبیوٗد تھے۔

سب انسپکٹر کو یقین ہو گیا کہ قلم ماجد صاحب ہی کا تھا میں سخت حیران تھا۔ عارف صاحب پر تو جیسے بجلی گر ی۔ وہ سخت بدحواس ہو رہے تھے۔ مگر ان کا غصہ کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"آپ کا ثبوت میں نے دیکھ لیا۔ ایسے ایسے ہزار ثبوت بھی اگر آپ پیش کریں تو میرے لئے بیکار ہیں میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قلم میرا ہے۔ اور اگر آپ رضامندی سے نہ دیں گے تو زبردستی آپ سے لے لوں گا۔ یہ میرے ایک عزیز دوست کی نشانی ہے اور مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کسی حال میں بھی اسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔ عدالت، جیل، رسوائی۔ ہر چیز کے لئے تیار ہوں"۔

میں نے کہا: "عارف صاحب بچوں کی سی باتیں نہ کیجئے۔ میری خاطر سے ذرا بیٹھ جائیے۔ ماجد صاحب سے مجھے دو تین باتیں کر لینے دیجئے"۔

عارف صاحب بیٹھ گئے۔ میں نے ماجد صاحب کو ایک طرف لے جا کر کہا:

"خدا کے لئے بتائیے تو یہ ماجرا کیا ہے۔؟"

انہوں نے کہا آج آٹھ دن ہوئے میں نے یہ قلم بیوی سے چھپا کر تسنیم کو دیا تھا"

میں نے پوچھا "کون تسنیم؟" انہوں نے کہا وہی شگوفہ۔ اس کا اصلی نام تسنیم ہے"۔

واقعے کی پوری حقیقت اب اچھی طرح واضح ہو گئی تھی۔ میں نے کہا: "ماجد صاحب! آپ ایک عزت والے ذمہ دار اور ذی ہوش انسان ہیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس

جھگڑے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور مقدمہ عدالت میں گیا تو آپ کی کیسی کچھ رسوائی ہوگی؟ آپ کی بیوی کو شبہ پہلے ہی ہوچکا ہے۔ اب یقین ہوجائے گا اور اس کا مآل جو کچھ ہوگا اُسے آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ عارف تو لڑکا ہے۔ جذبات کے جوش میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ خدا جانے کیا کچھ نہ کر گزرے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ یہ قلم اُسی کو دیدیں تسنیم کو جب آپ اپنا نہ بنا سکے تو اس ایک قلم کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اور یاد رکھئے تسنیم اب ہمیشہ کے لئے آپ کے ہاتھوں سے گئی۔ دنیا کی کوئی طاقت اب اُس کے دل کو عارف سے پھیر کر آپ کا نہیں بنا سکتی۔ پھر اس ہنگامے اور اس بربادی و رسوائی سے حاصل۔؟"

ماجد صاحب واقعی بہت ذی ہوش انسان تھے۔ مگر جذبات کے طوفان میں بہ نکلے تھے۔ میں نے اونچ نیچ سمجھائی تو بات اُن کی سمجھ میں آگئی۔ اُنہوں نے کہا "تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں وہ کیجئے"۔ میں نے کہا۔ اچھا ذرا ٹھہریئے۔ دو باتیں عارف سے بھی کرلوں" اس کے بعد میں نے عارف کو ایک طرف بلایا اور کہا "عارف صاحب آپ جانتے ہیں کہ آپ کس سے لڑ رہے ہیں؟" انہوں نے کہا "نہ جانتا ہوں نہ جاننے کی کچھ ضرورت سمجھتا ہوں مگر میں اپنا قلم ان سے لے کر چھوڑوں گا"

میں نے کہا "اتنا جوش اچھا نہیں۔ آپ نہیں جانتے تو مجھ سے سنئے۔ ماجد صاحب آپ کی تسنیم کے بڑے بہنوئی اور بمنزلہ باپ کے ہیں۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ اگر خدانخواستہ اگر مقدمہ عدالت میں گیا تو تسنیم اپنے بہنوئی کے مقابلے میں آپ کی حمایت کرے گی؟ اور آپ یہ ثابت کرسکیں گے کہ یہ قلم تسنیم نے آپ کو دیا تھا؟ آپ ابھی لڑکے ہیں۔ دنیا

کے نشیب و فراز آپ کیا جانیں تسنیم کی اتنی مجال بھی نہ ہوگی۔ کہ وہ آپ سے شناسائی کا بھی اقرار کرے۔ اس کا پہلا جواب یہ ہوگا کہ "میں تو اُنہیں جانتی ہی نہیں"۔ اس وقت آپ کیا ثبوت دیں گے اس بات کا کہ قلم آپ ہی کا ہے اور آپ نے ماجد صاحب کی جیب سے نہیں چرایا۔ ذرا غور تو کیجئے اُس وقت آپ کی کیا پوزیشن ہوگی؟ یاد رکھئے ماجد صاحب سے بگاڑ کر آپ کو اور جو کچھ نقصان پہنچے گا وہ تو رہا ایک طرف۔ آئندہ آپ زندگی بھر تسنیم کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیں گے"۔

میری باتیں سن کر عارف کا غصہ اور جوش آن واحد میں سرد پڑ گیا۔ وہ سہم گیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی آواز بھاری پڑ گئی تھی۔ اس نے کہا "تو پھر آپ ہی فرمایئے مجھے کیا کرنا چاہیئے"۔

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ قلم کی واپسی کا خیال چھوڑ دیجئے۔ اور ماجد صاحب سے اپنی غلطی کی معافی مانگئے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کے لئے عافیت کا کوئی راستہ نکل آئے"۔

عارف نے ایک ارادت مند مرید کی طرح میرے حکم کی تعمیل کی۔ اور سر جھکا کر نہایت عاجزانہ لہجے میں ماجد صاحب سے کہا "آپ بڑے ہیں۔ میں چھوٹا ہوں۔ مجھ سے قصور ہوا۔ معاف کر دیجئے"۔

سب انسپکٹر حیران ہو کر رہ گیا۔ ماجد صاحب کو بھی حیرت تھی۔ انہیں یہ امید نہ تھی کہ معاملہ اس خوبصورتی سے سلجھ جائے گا۔ وہ بے حد متاثر ہوئے۔ قلم جیب سے نکال کر وہ عارف

کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے: "لیجئے اب یہ قلم آپ ہی کا ہے۔" فرطِ حیرت سے سب انسپکٹر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ عارف کو کتنی خوشی ہوئی۔ اس کا اندازہ عارف کے سوا شاید کوئی نہیں کر سکتا۔

خلافِ معمول گاڑی یکایک ٹھہر گئی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ شاید سگنل ڈاؤن نہ تھا۔ یا کوئی اور وجہ ہوگی۔ سب انسپکٹر وہیں اتر گیا۔ عارف اور ماجد صاحب دونوں اپنی اپنی نشستوں پر سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے ماجد صاحب سے کہا: "اگر آپ خود غرضی کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر تھوڑی سی قربانی اور ایثار کے لئے تیار ہوں تو ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ ایسی بات جو آئندہ کے لئے بہت سے فتنوں کا دروازہ بند کر دے گی۔"

ماجد صاحب نے کہا: "فرمایئے۔" میں نے کہا: "جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔ عارف بہت اچھا لڑکا ہے۔ معزز باپ کا بیٹا۔ ذہین۔ تعلیم یافتہ۔ فارغ التحصیل ڈاکٹر، آئندہ ترقی کے بہت کچھ امکانات ہیں۔ اور یوں خدا کی جو مرضی ہو۔ اگر تسنیم کی شادی عارف سے ہو جائے تو میرے نزدیک ہر طرح مناسب ہے۔ اور اگر نہ ہوئی تو بہت ممکن ہے کہ دونوں کا یہ پوشیدہ ربط کچھ اور رنگ لائے اور خدانخواستہ عزت والوں کے ننگ و ناموس میں داغ لگے۔

ماجد صاحب نے بلا پس و پیش کہا: "مجھے کوئی عذر نہیں۔ مگر خدا جانے عارف کے والد بھی اس رشتے کو پسند کریں گے یا نہیں۔"

میں نے کہا "خیر وہ کوئی ایسی دشواری نہیں۔ مگر معاف کیجئے مجھے آپ کے متعلق ایک اور شبہ ہو رہا ہے۔ ماجد صاحب! میں نے زندگی بھر انسانی فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور گوناگوں تجربے حاصل کئے ہیں۔ اس لئے میں آپ کے متعلق بدگمانی پر مجبور رہوں خدا کرے میرا خیال غلط ہو مگر اس کا امکان بہت کم ہے۔ آپ اپنے دل میں یہ منصوبہ گانٹھ رہے ہیں کہ اگر عارف سے تسنیم کی شادی ہوگئی تو آپ کو سہولت رہے گی۔ پوری آزادی کے ساتھ ملنا جلنا ممکن ہوگا کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ عارف انتہا سے زیادہ آپ کا زیر بار احسان ہوگا تسنیم کے ساتھ آپ کے ربط ضبط کو کبھی شک وشبہ کی نظر سے نہ دیکھے گا۔ مگر یاد رکھئے کہ یہ منصوبہ فقط مجرمانہ ہی نہیں مجنونانہ بھی ہے۔ آپ کبھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔"

ماجد صاحب کچھ جھینپ سے گئے۔ مجھ سے بھڑ کر بیٹھے اور بڑی محبت سے میری گردن میں بانہہ ڈال کر بولے۔

"خدا کی قسم! آپ ضرور ایک روشن ضمیر انسان ہیں۔ آپ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا۔ یہ فاسد خیال میرے دماغ میں ضرور آیا تھا۔ مگر خدا کو حاضر وناظر جان کر اس وقت آپ سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی اس قسم کے خیالات کو اپنے دل میں راہ نہ دوں گا اور تسنیم کو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح سمجھوں گا۔"

پھر میں نے عارف سے گفتگو کی۔ جس وقت اُسے یہ معلوم ہوا کہ تسنیم سے شادی کا امکان ہے تو خوشی کے مارے اس کا عجیب حال ہوگیا۔ اس نے ایک با اخلاص

ارادت مند مرید کی طرح بے اختیار میرے ہاتھ چوم لئے اور کہنے لگا:

زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہ بھولوں گا۔ آپ نے عمر بھر کے لئے مجھے اپنا غلام بنا لیا ابا کو راضی کرنا کوئی بات نہیں۔ وہ اس معاملے میں میری مرضی کے خلاف کچھ نہ کریں گے۔"

تین مہینے کے بعد عارف اور تسنیم کی شادی ہوگئی۔ مگر افسوس تسنیم کی زندگی نے وفا نہ کی۔ آٹھ مہینے کے اندر اندر ہی وہ موت کی گود میں جا سوئی۔ اس اندوہ ناک حادثے نے عارف کا دل توڑ دیا۔ مدتوں سوگوار رہے۔ والدین نے لاکھ چاہا کہ دوسری شادی کر دیں مگر وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ کئی برس اسی طرح گذر گئے۔ پریکٹس بھی اب خاصی چل پڑی تھی۔ سن ۱۹۴۰ء کے آغاز میں انہیں ایمرجنسی کمیشن مل گیا۔ اور وہ ہندوستان سے ایسے گئے کہ پھر نہ لوٹے لڑائی ختم ہونے کے بعد مستقل طور پر لندن میں بس گئے۔ وہیں پریکٹس کرتے ہیں۔ میرے پاس کبھی کبھی خط آتا ہے۔

دوسرا سال ہے ماجد صاحب حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے اپنی دیرینہ آرزو کے مطابق مدینہ منورہ ہی میں راہئ ملک بقا ہوئے۔

سدا رہے نام اللہ کا۔!

سچّی کہانی

جُرم و گناہ؟

حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم اور مذہب کے قانون کو توڑنے والا گنہگار، کیونکہ حکومت اور مذہب کا ہر قانون انصاف پر مبنی ہے۔ بظاہر کتنی معقول بات ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انصاف کی آنکھیں بینائی سے محروم ہیں کہ انسانی فطرت کے تقاضوں کو نہیں دیکھ سکتیں۔

چوری جرم ہے۔ مرد و زن کا غیر شرعی تعلق گناہ ہے لیکن اگر مجلسی آئین کی زبردستیاں کسی کو اس جرم و گناہ کے ارتکاب پر مجبور کر دیں تو کیا تم اُسے مجرم اور گناہ گار کہوگے؟ کسی کو دریا میں دھکیل دو اور کہو کہ خبردار! دامن تر نہ ہونے پائے۔ کیا وہ اپنے دامن کو تر ہونے سے بچا سکتا ہے؟

طوائف کو آپ نے ہمیشہ ذلّت و حقارت کی نظر سے دیکھا لیکن کبھی یہ سوچنے

کی زحمت بھی گوارا کی طوائف کو طوائف کس نے بنایا؟ کسی شریف خاندان کی لڑکی جب یکایک گھر سے فرار ہو جاتی ہے تو اس کو تفرین وملامت کرنے کے سوا کبھی کوئی اور جذبہ بھی آپ کے دل میں ابھرا ہے؟ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اس مجرم اور گناہ گار لڑکی کو جرم وگناہ پر کس نے مجبور کیا؟ کیا بسا اوقات خود والدین اور سوسائٹی اس جرم وگناہ کا باعث نہیں ہوتے؟

آیئے۔ ایک عبرت ناک واقعہ سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ حقیقی مجرم اور واقعی گناہ گار کون ہے؟ وہ جسے عدالت نے سزا دی یا وہ جو درحقیقت اس جرم وگناہ کا باعث ہوا۔

اکیس برس گزرے جب میں پہلی بار ڈھاکا آیا تھا۔ اسی وقت یہ واقعہ میں نے سنا اور ایک ایسے شخص سے سنا جس نے بیشتر حالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے لیکن مجھے تو اس کی صداقت میں ذرہ برابر شک نہیں۔

اسلامی حکومت کے زمانے میں کتنے امرا شمالی ہندوستان سے آکر بنگال میں بس گئے۔ ایسے ہی ایک خاندان نے "باری سال" کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ سینکڑوں برس گذر گئے۔ دولت کی ڈھلتی پھرتی چھاؤں کہیں سے کہیں جا پہنچی اور بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ان لوگوں کے پاس بزرگوں کے ورثے میں سے نسبی شرافت پر بے جا غرور کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ پھر بھی راحت سے بسر ہوتی تھی۔

محمد علی خاں اسی گھرانے کے ایک فرد تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اولاد کی بڑی تمنا تھی۔ اسی آرزو میں اُنہوں نے چالیس برس کے سن میں دوسری شادی کی۔ نخلِ مراد بار ور ہوا۔ خدا نے نور دیدہ عنایت کی۔ محمد علی خان کا خاندان حسنِ صورت کے لحاظ سے آس پاس کے علاقوں میں پہلے سے بھی کافی شہرت رکھتا تھا لیکن یہ لڑکی تو واقعی جمال و رعنائی کا مجسمہ تھی۔ آسمان کا چاند زمین پر اُتر آیا تھا۔ کتنی پیاری صورت! مسکراتی تو معلوم ہوتا۔ گلاب کی شاداب کلی آہستہ آہستہ کھل رہی ہے محمد علی خاں اُسے دیکھ کر جیتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ ہماری دادی اماں کے چہرے کا بالکل یہی انداز تھا۔ مگر ان کا سا رنگ کسے نصیب۔ وہ تو فرنگنوں کو مات کرتی تھیں اُنہیں کے نام پر محمد علی خان نے اپنی بچی کا نام "گوہر شاد" رکھا تھا۔

بچپن ہی میں گوہر شاد کے حسن و جمال کا چرچا ہونے لگا۔ محمد علی خاں کے پڑوسی خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین ایک نہایت معزز زمیندار اور نہایت معقول انسان تھے۔ محمد علی خاں کی خاندانی شرافت کا اُنہیں بہت خیال تھا۔ دونوں خاندانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اور ایک دوسرے کے یہاں مستورات کی آمد و رفت تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔

خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین کا سب سے چھوٹا لڑکا ابوالحسنات محمد علی خاں کو "چچا" کہا کرتا تھا۔ وہ بھی ابوالحسنات کو بہت چاہتے تھے۔ ابوالحسنات گوہر شاد سے دو برس بڑا تھا۔ گوہر شاد کو وہ "شادی" کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ اُسے "اَبّو" کہتی

تھی۔ چھٹ پن میں دونوں بچے اکثر سارا سارا دن ایک ساتھ گزار دیتے۔ کبھی یہ اُس گھر میں کبھی وہ اِس گھر میں۔

ابوالحسنات خالص بنگالی ماں باپ کی اولاد تھا۔ لیکن دولت کی فراوانی اور زندگی کی آسائشوں نے اس کے ظاہر کو سنوارنے میں بڑی مدد کی تھی۔ رنگ روپ بھی اچھا تھا۔ ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ صحت بھی اچھی تھی۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ بڑا ہو کر یہ لڑکا بڑا سجیلا جوان نکلے گا۔

دونوں جب کچھ اور بڑے ہوئے تو اُن کی تعلیم ایک ہی اُستاد کے سپرد ہوئی کھیل کے سوا اب پڑھنے کے اوقات بھی یکجائی میں گزرنے لگے۔ ابوالحسنات کا سن اب نو سال کا تھا۔ گوہر شاد کل سات برس کی تھی۔ یہ ننھی معصوم روحیں کچھ اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی تھیں کہ دیکھنے والے کبھی کبھی چونک پڑتے تھے اور بے اختیار کہہ اُٹھتے تھے کہ "سرخاب کا جوڑا ہے۔ جب دیکھو ایک دوسرے کے بغیر چین ہی نہیں۔"

محمد علی خاں اِس قسم کی باتیں سن کر بظاہر ہنس دیتے تھے۔ مگر دل میں اِس خیال کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ ابوالحسنات کچھ بھی سہی۔ آخر ابوالخیر صلاح الدین ہی کا تو بیٹا تھا۔ اور ابوالخیر صلاح الدین مانا کہ دولت مند تھے بڑے زمیندار تھے۔ خطاب یافتہ تھے مگر خاندان؟ خاندان کا تو کچھ پتا ہی نہ تھا۔ محمد علی خاں جن کے پاس اپنے اصیل و نجیب بزرگوں کا کئی سو برس کا مستند

شجرہ موجود تھا۔ جو اصالت و نجابت ہی کو انسانیت کا اصلی جوہر سمجھتے تھے۔ جنہیں اپنی شرافت نسبی پر حد سے زیادہ فخر اور غرور تھا۔ وہ کب اس بات کو گوارا کر سکتے تھے کہ ایک ایسا لڑکا جس کے دو پشت قبل کے بزرگوں کے اصل و نسب کا کچھ پتا ہی نہ تھا۔ اُن کی نور دیدہ کا رفیق زندگی بنے اور اُن کا داماد کہلائے۔ یہ بات ناممکن اور قطعی ناممکن تھی۔ دنیا کی ساری خوبیاں ایک طرف تھیں اور خاندانی شرافت ایک طرف۔ اور محمد علی خاں کے خیال کے مطابق ابوالحسنات کا دامن "نجابت" کی دولت سے خالی تھا۔ اور جب یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ سونے کے انبار مٹی کا ڈھیر ہیں۔ بایں ہمہ ننھی گوہر شاد کی معصوم روح صرف ابوالحسنات کے قرب ہی میں خوش رہ سکتی تھی۔

معلوم نہیں جنسی میلان کا آغاز کب سے ہوتا ہے اور وہ جذبہ جسے عرفِ عام میں محبت کہتے ہیں، کب بیدار ہوتا ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ بلوغ کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد انسان کے یہ حاسّے جاگ اُٹھتے ہیں۔ یہ خیال اگر صحیح ہے تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ گوہر شاد اور ابوالحسنات کے معاملے میں فطرت کا یہ قانون بدل گیا تھا۔ گوہر شاد جس وقت کل نو برس کی تھی اور ابوالحسنات گیارہ سال کا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اسی وقت ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ کئی باتیں ایسی دیکھی گئیں جو اس عمر کے بچوں کے لئے نئی ہیں۔ ایک دفعہ مولوی صاحب نے دیکھا کہ ابوالحسنات گوہر شاد کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کبھی وہ انہیں اس کے

چہرے پر بکھیر دیتا تھا۔ کبھی اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا تھا۔ اور گوہر شاد مسکراتے جا رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک بار ابوالحسنات کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اور اپنے دونوں رخساروں پر رکھ لئے۔ اچانک مولوی صاحب سامنے آ گئے۔ دونوں گھبرا گئے۔ مولوی صاحب خود حیران تھے جب انہوں نے اِس واقعہ کا تذکرہ ابوالحسنات کی والدہ سے کیا تو اپنی رائے صرف اسی قدر ظاہر کی کہ "بی بی صاحب" یہ بیسویں صدی ہے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" اس سے ملتی جلتی باتیں ابوالحسنات کی والدہ خود بھی دو ایک بار دیکھ چکی تھیں۔ مگر انہوں نے کبھی اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ محض طفلانہ خوش فعلیاں سمجھی تھیں۔ اب مولوی صاحب نے کہا تو انہیں بھی کچھ احساس ہوا۔ مگر ان کے نزدیک اِس معصومانہ محبت میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ طفلی کے جھولے میں جوانی پینگ بڑھانے لگی۔ گوہر شاد اور ابوالحسنات کے ساتھ ساتھ اُن کی محبت بھی جوان ہو گئی۔ پُرشور جوانی۔ پُرشور محبت اب وہ پہلی سی آزادیاں نہ تھیں۔ ہر وقت کی یکجائی نہ تھی۔ ہر روز کا ملنا نہ تھا۔ قدم قدم پر پابندیاں۔ بات بات میں روک ٹوک۔ اِنسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جس چیز سے اُسے روکا جائے۔ اسی طرف اور بھی جھکتا ہے۔ خصوصاً محبت کی راہ میں تو رکاوٹیں آگ پر تیل کا کام کرتی ہیں۔

گوہر شاد اور ابوالحسنات کے درمیان موانع کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کی گئیں۔ لیکن طوفانی محبت کا سیلاب اُنہیں تنکوں کی طرح بہا لے گیا۔ وہ

چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ بزرگوں کی مخالفت کے باوجود ملتے رہے اور ہر روز ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب ہوتے گئے۔

گوہر شاد اب اٹھارہ برس کی تھی۔ ابوالحسنات کو بیسواں سال تھا۔ دو برس سے وہ کلکتہ میں تعلیم پا رہا تھا۔ بی۔ اے کا امتحان دے کر گھر آیا ہوا تھا۔ انہیں دنوں اتفاقاً ایک ضرورت سے محمد علی خاں کو چاٹگام جانا پڑا۔ میدان خالی تھا۔ آرزو مند دلوں نے ملاقات کا سرانجام کیا۔ وقت اور مقام مقرر ہوا۔ رات ہوئی تو گوہر شاد دبے پاؤں گھر سے نکلی۔ ڈرتی جھجکتی وعدہ گاہ کی طرف چلی۔

گرمیوں کی سہانی رت اور چاندنی رات۔ خواب ناک رومانی فضا، نور کا امنڈتا ہوا سیل، ذرّے ذرّے، پتّے پتّے پر چاندی کے ورق چڑھا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے سائے کی تاریکی میں بھی صبح کے دھندلکے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کامل سکوت چھایا ہوا تھا۔ تالاب کے کنارے۔ ناریل کے درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس۔ ابوالحسنات۔ گوہر شاد کا منتظر تھا۔ اس نے ایک چادر زمین پر بچھا رکھا تھا۔ گوہر شاد آئی۔ سرد جسم۔ خشک ہونٹ اور دھڑکتا ہوا دل۔

ابوالحسنات نے بے اختیار ہو کر پکارا "شادی"

اس نے آہستہ سے کہا "جی"

اُس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ غمگینی تھی۔ مایوسی تھی۔ وہ ایک منٹ تک خاموش رہی۔ پھر یکایک ایک طرف کو جھکی جیسے کوئی لڑکھڑاتا ہے۔ اور اس

نے ایک درخت کا سہارا لے لیا۔ ابوالحسنات نے گھبرا کر کہا: "خیر ہے۔ کیا ہوا؟"

اس نے کہا: "کچھ نہیں۔ چکر سا آرہا ہے۔"

ابوالحسنات نے سہارا دے کر اسے چادر پر بٹھایا۔ اور خود بھی اس کے پاس چادر پر بیٹھ گیا۔ اب گوہر شاد کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے دونوں خاموش تھے۔

ساڑی کا پلّو گوہر شاد کے سر سے ڈھلک گیا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے آج اس نے جان بوجھ کر چوٹی نہیں گوندھی تھی۔ ابوالحسنات کو اس کے کھلے ہوئے بال بہت پسند تھے۔ اور واقعی کتنے خوبصورت تھے اس کے بال۔ کتنے سیاہ، کتنے نرم، کتنے گھنے، کتنے لمبے۔ ابوالحسنات نے انہیں اس کے چہرے پر بکھیر دیا۔ پھر انہیں اپنی آنکھوں سے لگایا۔ ایک آہ کی اور پھر انہیں چوم لیا۔ گوہر شاد نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔

ابوالحسنات نے کہا: "ڈارلنگ! تمہارے ہاتھ اس قدر ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں۔"

اس نے کہا: "معلوم نہیں کیا بات ہے۔ دل بیٹھا جا رہا ہے۔" ابوالحسنات نے بے اختیار اپنا سر اس کے زانو پر رکھ دیا۔ گوہر شاد کی نازک انگلیاں اب ابوالحسنات کے گھونگر والے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ چند لمحے اسی طرح گذر گئے۔ ابوالحسنات نے سر اٹھایا اور گوہر شاد سے بھڑ کر بیٹھ گیا۔ گوہر شاد فوراً پیچھے کھسک گئی۔

ابوالحسنات نے کہا: "اللہ! اتنی بیزاری۔"

گوہر شاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ ابوالحسنات نے کہا:۔

"شادی! ڈارلنگ! سر اٹھاؤ۔ ادھر دیکھو۔ آج میں تمہیں ایک بڑی خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ یہ چوری چھپے کی ملاقات کا زمانہ اب بہت جلد ختم ہونے والا ہے اب ہمیں زندگی میں کوئی جدا نہ کر سکے گا۔ ابا جان کو میں نے راضی کر لیا۔ امی تو پہلے ہی راضی تھیں۔ "چچا" چاٹگام سے واپس آ جائیں۔ تو شادی کا پیغام بھیجا جائے۔"

گوہر شاد اسی طرح بے حس و حرکت، سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ ابوالحسنات ذرا ٹھیرا۔ پھر اس نے تعجب سے کہا:۔

"شادی! تم کہاں ہو؟ تم نے سنا جو کچھ میں نے کہا؟"

گوہر شاد نے آہستہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "جی ہاں۔ سُن لیا۔"

اس کا سر اب بھی اسی طرح جھکا ہوا تھا۔ ابوالحسنات نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُس کا سر اوپر کو اٹھایا اور پھر حیرت زدہ ہو کر بولا:۔

"ارے یہ کیا؟ شادی تم رو رہی ہو؟ ہیں۔ آخر ہوا کیا؟"

گوہر شاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔

ابوالحسنات تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً قمیض کی جیب سے رومال نکالا۔ اور گوہر شاد کے آنسو پونچھے اور کہا:

"خدا کے لئے بتاؤ تو آخر کیا ہوا؟ میرا تو خون خشک ہوا جا رہا ہے۔"

گوہر شاد نے سر اٹھایا۔ حسرت آلود نگاہوں سے ابوالحسنات کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"ابّو یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب ہم کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے آج میں تمہیں کچھ بتانے آئی ہوں۔ ایک جگہ سے پیغام آیا ہے۔ شادی وہیں ہوگی۔ اور جلد ہوگی۔ لیکن ابّو! میں خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں۔ میری روح ہمیشہ سے تمہاری ہے۔ ہمیشہ تمہاری رہے گی۔ اپنے جسم پر مجھے اختیار نہیں۔ میں وہ تمہارے حوالے نہیں کر سکتی۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ قسمت سے کون لڑ سکتا ہے۔ لو! بس اب اٹھو۔ دیر ہو رہی ہے۔ مگر ابّو! تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟" یہ کہا اور پھر اسکی آنکھوں سے موتی برسنے لگے۔

ابوالحسنات پر جیسے بجلی گری۔ اس کی گویائی سلب ہوگئی۔ چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ وہ آنکھیں پھاڑے گوہر شاد کو دیکھ رہا تھا مبہوت۔ خاموش۔ بھیانک کئی لمحے اسی طرح گذر گئے۔ گوہر شاد نے ساڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

اب وہ چونکا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ سر کو جھٹکا دیا۔ اور بولا:

"شادی! کیا چچا نے اس پیغام کو منظور کر لیا۔؟"

"منظور ہی سمجھو۔ اگرچہ قطعی جواب ابھی تک نہیں دیا ہے۔"

"شکر ہے ابھی کوشش کی گنجائش باقی ہے۔"

"بالکل نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں نے کہا نا کہ شادی وہیں ہوگی۔"

"آخر اس کی وجہ؟ کیا "چچا" ابا جان کی خواہش کو رد کر دیں گے؟ کیا میں اُن کی نظر میں اتنا بُرا ہوں۔"

"یہ بات نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟ کیا وہ شخص کوئی بہت بڑا آدمی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"ابو! میں تمہیں کیونکر سمجھاؤں۔ ابا جان جب کسی بات کا ارادہ کر لیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی۔"

"آخر وہ ہے کون شخص؟"

"ہمارے دور کے ایک عزیز ہیں۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں جب تم گھر آئے تھے۔ جہاز پر تمہارا اُن کا ساتھ ہوا تھا۔ وہ ابا جان سے ملنے ہمارے یہاں آئے تھے۔"

" ابوالحسنات نے حیرت سے کہا۔

" کون وہ تمہارے چچا؟ عبدالعزیز خاں، سوناپور والے۔ کچھ تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ اور وہ تو بیوی بچوں والے آدمی ہیں۔"

" کئی مہینے ہوئے ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔"

" اور بچے؟"

" بچے تو کئی ہیں۔ بیوی کے مرنے کے بعد بڑی لڑکی کی اُنہوں نے شادی کر دی۔ چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا گھر میں اب کوئی نہیں۔ اسی لئے وہ دوسرا عقد کرنا چاہتے ہیں۔"

" اُن کی عمر اب شادی کرنے کی ہے! چالیس کے پار ہوں گے۔"

" تو اس سے کیا ہوتا ہے۔"

" نہیں شادی! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" چچا " ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں حد سے زیادہ چاہتے ہیں۔ زندگی بھر کے لئے تمہیں دوزخ میں نہیں جھونک سکتے۔ اور مجھے بھی اُنہوں نے ہمیشہ بیٹے کی طرح سمجھا ہے۔ ابا جان سے دو پشت کے تعلقات ہیں۔ ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ان کی خواہش کو ہرگز رد نہیں کر سکتے۔ پھر عبدالعزیز خاں کی حیثیت ہی کیا ہے۔ بیچارے غریب آدمی ہیں۔ عمر کے لحاظ سے بھی تمہارا ان کا کوئی جوڑ نہیں۔ تم ان کی بیٹی سے بھی چھوٹی ہو۔ اور چچی جان تو جیتے جی تک اس رشتہ پر راضی نہیں ہو سکتیں۔

"نگراں کی سنتا کون ہے۔ وہ سخت مخالف ہیں۔ جب سے یہ پیغام آیا ہے رات دن ان کے رُوٹھتے ہی گزرتے ہیں۔ پرسوں رات بھی یہی گفتگو تھی میں نے سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں "خدا کے لئے ذرا اس بات کو تو سوچئے۔ اٹھارہ برس کی لڑکی اور بیالیس برس کا مرد۔ بھلا کوئی جوڑ بھی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہماری بچی زندگی بھر رو رو کے کاٹے"۔ ابّا جان نے کہا "بعض اوقات تم بالکل بے وقوفی کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ تمہیں یاد ہے جس وقت ہماری شادی ہوئی تھی اس وقت تمہارا کیا سن تھا۔ اور میری کیا عمر تھی۔ چالیس اور سترہ کا، جوڑ ہو سکتا ہے۔ بیالیس اور اٹھارہ کا کیوں نہیں ہو سکتا۔ آخر کیا خرابی ہوئی اس جوڑ میں؟ کیا تمہیں کوئی تکلیف پہنچی؟ کیا تم نے ساری عمر رو رو کے کاٹی؟" اماں جان خاموش ہو گئیں۔ اِس بات کا جواب ہی کیا ہے؟"

"چچا" کا سن اب ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ سوچتے ہونگے کہ ان کی کھلی آنکھوں تمہاری شادی ہو جائے۔ غالباً کوئی دوسرا مناسب رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے عبدالعزیز خاں کا پیغام رکھ لیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں سے "نسبت" جانے کے بعد یقیناً وہ اپنا ارادہ بدل دیں گے"۔

"نہیں الّو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"۔

"آخر ہم لوگوں میں کیا کھوٹ ہے؟ اور عبدالعزیز خاں میں ایسے کیا لال لگے ہیں؟"

گوہر شاد خاموش تھی۔ ابوالحسنات نے پھر کہا۔

"خدا کے لئے بتاؤ نا آخر کیا بات ہے؟"

"بتانے سے کیا فائدہ؟ سن کر تمہیں اور رنج ہوگا؟"

"نہیں شادی، تمہیں میرے سر کی قسم۔ سچ سچ بتا دو۔ صاف صاف کہہ دو۔"

"ابّو! تمہیں خود بھی ایک حد تک اندازہ ہوگا۔ ابّا جان کے نزدیک خاندانی شرافت ونجابت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اور کسی دوسرے خاندان کو وہ اپنے لگے کا نہیں سمجھتے اپنے خاندان میں کوئی ایسا مناسب لڑکا نہیں جس سے میری شادی کر دیں۔ جو ہیں وہ نکھٹو۔ ناکارہ۔ بدچلن۔ اسی مجبوری سے انہوں نے عبدالعزیز خاں کے پیغام کو واپس نہیں کیا ہے۔"

"تو ہم لوگ ان کے نزدیک ذلیل اور کمینے ہیں۔" ابوالحسنات نے نہایت آزردگی کے لہجے میں کہا۔

"آخر بُرا مان گئے نا۔ اسی لئے تو میں نہیں بتاتی تھی۔"

"اُن کا خیال تو میں نے سُن لیا۔ اور خود تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ابّو! کیا آج آخری ملاقات کے موقع پر تم میرا دل دکھانے آئے ہو۔ مجھ سے میرا خیال پوچھتے ہو۔ کیا تم خود نہیں جانتے؟"

"تو پھر کوئی دشواری نہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ہماری راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ "چچا" کے خیالات، ایام جاہلیت کے خیالات ہیں۔ انہیں اسلام سے کوئی واسطہ

نہیں اس لئے ہماری نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ اگر چچا نے میرے پیغام کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا کہ وہ ہمیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ تو ناچار مجھے بھی اپنا دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ شادی" تمہیں پانے کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی کرسکتا ہوں۔ لیکن تمہاری مدد کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں"۔

"مگر میں کیا کرسکتی ہوں؟"

"چچا" کی ضد کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم دونوں ہمیشہ کے لئے اس دیس ہی کو چھوڑ دیں۔ یہاں سے کہیں اور نکل چلیں۔ خدا رزاق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری اس حرکت سے ابا جان سخت ناراض ہونگے لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ وقت گزرنے پر ان کا غصہ دھیما پڑ جائے گا۔ اور میں انہیں منانے میں کامیاب ہو جاؤں گا پھر انشاء اللہ ہمارے لئے کوئی دشواری باقی نہ رہے گی۔ بتاؤ تم تیار ہو؟"

"گوہر شاد خاموش تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا حسرت و یاس کا مرقع بنی۔ ناؤ پر کہنی ٹیکے ہتھیلی پہ گال رکھے خلا میں دیکھ رہی تھی۔ ابوالحسنات ایک لمحہ خاموش رہا، پھر اس نے کہنا شروع کیا:۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ ہمت سے کام لینے کا وقت ہے۔ میری جان ڈرو نہیں۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم بالغ ہو صاحب اختیار ہو۔ انشاء اللہ ہم شریعت کے قانون کے مطابق اپنی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرلیں گے۔ پھر کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اور کہے گا تو کیا کرے گا۔ دنیا کا منہ کس نے بند کیا ہے۔ کہنے والوں

نے کس کو چھوڑ دیا۔ اور کیا کیا نہیں کہا۔ پیغمبروں تک کو نہ چھوڑا۔ ہماری تو بساط ہی کیا ہے۔ دنیا کی خاطر ہم زندگی بھر کی نامرادی مول نہیں لے سکتے۔"

میں اپنے لئے نہیں ڈرتی۔ مجھے اپنی جان اتنی پیاری نہیں۔ مگر خاندان کی عزت میں داغ لگانا اور ابا جان کو دنیا کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی۔ جان دے سکتی ہوں، ننگ و ناموس کی قربانی نہیں کر سکتی۔ گھر سے بھاگ جاؤں! اف اللہ!! کاش میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ خاندان کی آبرو اور بزرگوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ایوّ! مجھے زہر ملا دو۔ خدا کی قسم آنکھیں بند کر کے پی لوں گی۔ تمہارے قدموں پر جان دے دوں گی۔ لیکن گھر سے بھاگ جاؤں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ کاش تم میری طرح اس چیز کو محسوس کر سکتے۔"

"دیکھو شادی! چچا کی طرح خیال پرست نہ ہو۔ ہم نے کوئی قصور نہیں کیا کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔ اخلاق۔ مذہب اور قانون کے مطابق ہم اپنی زندگیاں ایک دوسرے سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ہمیں کیوں روکا جاتا ہے؟ کیوں ہمیں "بری راہ" اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟ آخر قصور کس کا ہے۔ ہمارا یا دوسروں کا۔"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر ایوّ! برائی بہرحال برائی ہے شرفا میں ایسا نہیں ہوتا انسان کو اپنی زندگی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ لیکن آبرو کے مقابلے میں غیرت مند انسان جان کی بھی پروا نہیں کرتے۔"

"تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں بے غیرت ہوں۔ اسی لئے تمہیں بدراہی پر آمادہ

کہ رہا ہوں۔ ہائے شادی۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔"

"اُبُو! اللہ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے سینے میں چھری کیوں نہیں بھونک دیتے۔ کیا قیامت ہے۔ میں تمہیں بے غیرت سمجھتی ہوں؟ تم مجھ سے ایسے ہی بدگمان ہو۔؟"

یہ کہا اور بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تو پھر اور کیا سمجھوں۔ تم خود ہی تو یہ سب کچھ کہہ رہی ہو۔"

"ہاں میں کہہ رہی ہوں۔ لیکن۔ ۔ ۔"

"خیر! اب اس ذکر کو جانے دو۔ میں ابھی تک مایوس نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ چچا انکار نہیں کریں گے۔ اور اگر انکار کیا تو پھر جو قدرت کو منظور رہے وہی ہو گا۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔ لو اب اُٹھو۔ تمہیں بہت دیر ہو گئی۔ کہیں تلاش نہ شروع ہو جائے۔"

دونوں کھڑے ہو گئے۔ گوہرشاد بہت مایوس۔ بہت اداس تھی۔ ابوالحسنات کے لہجے میں عزم و استقلال تھا۔ اس نے گوہرشاد کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پہلے اپنے گالوں پر رکھے۔ پھر اُنہیں چوم لیا۔ پھر چھوڑ دیئے۔ اور اس کے لمبے لمبے عنبریں بالوں کی دو لٹیں لے کر اس کے چہرے پر بکھیر دیں۔ پھر دیوانہ وار انہیں اپنی آنکھوں سے لگایا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ پھر قریب ہو کر اُنہیں گردن میں لپیٹ لیا۔

گوہرشاد خاموش تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر ایک ذرا پیچھے کو جھکا یا

وہی وہی آہ اُس کے ہونٹوں سے نکلی اور کنول کے پھولوں میں سے شبنم چھلک پڑی۔

خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین نے ابوالحسنات کے لئے گوہر شاد کی خواستگاری کی۔ محمد علی خاں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "افسوس میں دوسری جگہ زبان دے چکا ہوں اس لئے مجبور ہوں" حالانکہ یہ بات خلاف واقع تھی۔

چند ہی روز کے بعد گوہر شاد کا عقد عبدالعزیز خاں سے ہو گیا۔ اور وہ نامرادیوں کا ہجوم اپنے دل میں لئے سوتاپور سدھاری۔ اس رات کے بعد پھر ابوالحسنات سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔

اس حادثہ نے ابوالحسنات کا دل توڑ دیا جس باغ کو اُس نے بچپن سے لے کر جوانی تک اپنے تخیل کی مدد سے سجایا سنوارا تھا۔ نامرادی کی آندھیوں سے ایک پل میں اجڑ گیا۔ تباہ ہو گیا۔ اس میں آگ لگ گئی جل کر سیاہ ہو گیا۔ اُس کی کشتی کنارے پر پہنچکر ساحل سے ٹکرا گئی۔ پاش پاش ہو گئی۔ اُس کی آرزوؤں کا کارواں منزل پر پہنچکر لٹ گیا۔ اب اس کے پاس ایک ٹوٹا ہوا دل تھا۔ اور بس۔ ہاں دو جلتے والی آنکھیں جو کبھی کبھی نمناک ہو جاتی تھیں۔ وہ گھر پر نہ ٹھیر سکا۔ وارفتگی کے جوش میں کسی سے کچھ کہے سنے بغیر، خدا جانے کہاں غائب ہو گیا۔ کچھ پتا نہ چلا کہاں گیا اور اس پر کیا گزری۔ گھر میں ایک کہرام بپا تھا۔ ماں نے روتے روتے اپنا حال متباہ کیا تھا۔ باپ سب کے سامنے نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے۔ مگر چھپ چھپ

کے رہتے جوان اور ہونہار بیٹے کی گمشدگی سے ان کا دل خون ہوگیا تھا۔

محمد علی خاں سے ان کے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے۔ محمد علی خاں کو خود بھی ابوالحسنات کے اس طرح گم ہو جانے کا بہت صدمہ تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا سب کچھ انہوں نے خود ہی تو کیا تھا۔

اِس حادثہ کو تقریباً سوا برس گذر گیا۔ ابوالحسنات کی گم شدگی کا حال گوہر شاد کو بھی معلوم ہوگیا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دل میں آتے تھے کبھی غصے کے مارے اُس کا خون کھولنے لگتا۔ کبھی شدتِ یاس سے جی ڈوبنے لگتا۔ کبھی گھنٹوں اکیلی بیٹھی کچھ سوچتی رہتی۔ کبھی جی امنڈ تا تو آنکھوں سے دریا بہاتی بھوک اور نیند سے دشمنی ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی دو دو وقت یونہی گذر جاتے۔ راتوں کو جاگنا تڑپنا اور رونا زندگی کا معمول ہوگیا تھا۔ شہابی رخسار زرد پڑ گئے۔ غزالی آنکھیں اب سچ مچ بیمار معلوم ہوتی تھیں۔ پھول جیسا شگفتہ و شاداب چہرہ کملا کر بے رونق ہوگیا تھا۔ چاند گہن میں آگیا تھا۔ پھر قیامت یہ ہوئی کہ شادی کے تیسرے ہی مہینے عبدالعزیز خاں پر فالج گرا۔ ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں بیکار ہو گیا جب سے وہ صاحبِ فراش تھے۔ رات دن ان کی خدمت۔ ان کے دو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال۔ گھر کا سارا کام کاج۔ یہ وہ مشاغل تھے جن میں گوہر شاد کی بے کیف زندگی گذر رہی تھی۔ ابوالحسنات کی یاد نے اب تک اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ خصوصاً جب چاندنی راتیں ہوتیں۔ وہ آخری ملاقات یاد آتی۔

تڑپاتی، رلاتی، اور نیم جان کر کے چھوڑ جاتی۔ زندگی میں اس کے لئے اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ دل میں صرف ایک آرزو تھی موت کی۔ مگر اس کے پورے ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ شادی کے بعد چودہ پندرہ مہینے اسی مستقل جانکنی میں گذر گئے۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ عبدالعزیز خاں اندر کمرے میں سو رہے تھے گوہر شاد کسی ضرورت سے کوٹھے پر چڑھی۔ دیکھا سامنے سے ایک فقیر چلا آتا ہے۔ گیروا کفنی پہنے چہرے پر بھبوت ملے۔ گلے میں جھولی۔ ہاتھ میں اکتارہ بڑے بڑے بال۔ خاکستر آلودہ گھنی ڈاڑھی۔ ننگے پاؤں۔ اُسے دیکھ کر خدا جانے کیوں گوہر شاد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فقیر اس کے گھر سے ذرا دُور کھجور کے ایک پیڑ کے نیچے۔ اس کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے اپنا اکتارا سنبھالا اور آہستہ آہستہ بنگلا زبان میں ایک گیت گانا شروع کیا۔ مضمون اس کا یہ تھا:۔

پھولوں کی جو قدر نہ جانے، پھول ہوں اس کے دامن میں

نکہتِ گل میں جان ہو جس کی، جانے نہ پائے گلشن میں

اس کی آواز میں بلا کا سوز، غضب کا درد تھا۔ بس اسی ایک شعر کی تکرار کئے جارہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نغمہ نہیں فریاد ہے۔ اس کی بیتاب روح کی پکار ہے۔ گوہر شاد کوٹھے سے اتر آئی۔ اور ڈیوڑھی میں۔ دروازے کے

قریب پہنچکر۔ کواڑ کی اوٹ سے اس کا گانا سننے لگی۔ فقیر آنکھیں بند کئے۔ اپنے خیالوں میں گم، دنیا و مافیہا سے بے خبر گائے جا رہا تھا۔ گائے جا رہا تھا۔ اس کی آواز تیر و نشتر کی طرح گوہر شاد کے کلیجے میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک ان کچوکوں کی تاب نہ لا سکی، تلملا اُٹھی، تڑپ گئی، اس کا سر چکرانے لگا۔ کسی طرح اس نے خود کو سنبھالا۔ عبدالعزیز خاں کے ایک چھوٹے بچے کو بلایا اور کہا "بیٹے! ان سائیں جی کو بلا لاؤ۔ بیچارے بھوکے ہوں گے۔ انہیں کھانا کھلوا دو۔"

بچہ دوڑتا ہوا فقیر کے پاس گیا اور کہا:۔

"سائیں جی! اماں آپ کو بلاتی ہیں۔ چلو کھانا کھا لو۔"

فقیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ کچھ سوچا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بچے کے ساتھ دروازے سے کمرے میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ گوہر شاد کے اشارے سے بچے نے دروازہ بند کر دیا۔ اور خود اپنے کمرے میں تخت پر جا لیٹا۔ گوہر شاد ایک کشتی میں کھانا لگا کر لائی۔ کشتی تخت پر رکھ دی۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

"ابو! یہ تم! یہ کیا حال بنایا ہے تم نے؟"

"جو تم نے چاہا تھا۔" ابوالحسنات نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

گوہر شاد کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ تخت پر ابوالحسنات کے پاس بیٹھ گئی بیٹھ نہ جاتی تو گر پڑتی۔ دونوں کے سینوں میں جذبات کا طوفان زور شور سے امنڈ رہا تھا۔ مگر زبانیں خاموش تھیں۔ آخر ابوالحسنات نے ابتدا کی۔ اس نے اندوہناک

آواز میں کہا۔

"شادی ڈارلنگ!!

"گوہر شاد نے آہستہ سے کہا "جی" اور بے اختیار ابوالحسنات کے شانے پر سر رکھ دیا۔ آنکھوں کے چشمے جو اب کچھ دنوں سے خشک ہو چکے تھے یکایک ان میں طغیانی آ گئی۔ ابوالحسنات نے آہستہ سے پہلو بدلا۔ اب گوہر شاد کا سر ابوالحسنات کے آغوش میں آسودہ تھا۔ ابوالحسنات کے تشنہ کام لب گوہر شاد کے بے رونق بالوں میں اپنی کھوئی ہوئی زندگی ڈھونڈھ رہے تھے۔

اس دن کے بعد سونا پور کے لوگوں نے بارہا اس فقیر کو سونا پور آتے دیکھا مگر وہ کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کرتا تھا چپ چاپ اپنی راہ چلا جاتا تھا۔ لوگ اس کی اس روش سے حیران تھے۔ وہ اُسے ایک نہایت برگزیدہ اِنسان اور ایک مقدس ہستی سمجھتے تھے۔ کئی مہینے اسی طرح گذر گئے۔

بنگال کے دیہات یوپی اور پنجاب کے دیہات سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں بستی کے کل گھر ایک ہی جگہ اور ایک دوسرے سے بہت قریب نہیں ہوتے۔ بلکہ دُور دُور ہوتے ہیں۔ بنگلا زبان میں گھر کو "باڑی" کہتے ہیں۔ درمیان میں باڑی اور اس کے ارد گرد کھیت۔ پھر کچھ فاصلے پر ایک اور "باڑی" اور اس کے آس پاس کھیت۔ اور اسی طرح یہ مکانات دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ کھیتی باڑی کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

عبدالعزیز خاں کا مکان بھی دوسرے گھروں سے دُور، اور بالکل اکیلا واقع ہوا تھا۔

ایک رات جب کہ طوفانی ہوا زور شور سے چل رہی تھی۔ گھنگھور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ ایک شخص ٹاٹ کی بوری اوڑھے ہاتھ میں ایک لمبا بانس لئے چوروں کی طرح چوکنا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا۔ عبدالعزیز خاں کے مکان کی پشت پر پہنچا۔ عبدالعزیز خاں کے سونے کے کمرے میں پیچھے کی طرف ایک جنگلے دار کھڑکی تھی۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اُس شخص نے اپنا بانس دیوار کے سہارے لگا کر کھڑا کر دیا۔ پھر سلاخوں میں سے جھانک کر کمرے کے اندر دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک ٹورچ نکالی اور اُس کی روشنی کمرے میں ڈالی۔ عبدالعزیز خاں اکیلے ایک بڑی مسہری پر لیٹے، بے خبر سو رہے تھے۔ اُس شخص نے ٹورچ بند کر دی بانس اٹھایا اور سلاخوں میں سے کمرے کے اندر پہنچا دیا۔ اس کے بعد پھر ٹورچ جلائی۔ کمرے کے اندر جھانکا۔ بانس کو کچھ اونچا نیچا کیا۔ پھر دو تین منٹ تک ٹورچ کی روشنی میں بڑے غور سے کمرے کے اندر جھانکتا رہا۔ پھر ٹورچ بند کر دی۔ بانس کو آہستہ سے باہر کھینچ لیا۔ اور دبے پاؤں جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

صبح ہوئی۔ عبدالعزیز خاں کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ بچے زار و قطار ر

رو رہے تھے۔ ملازمہ رو رہی تھی۔ نوکر رو رہا تھا۔ گوہر شاد مردوں کی طرح ایک تخت پر پڑی تھی۔ اس پر غش کی سی کیفیت طاری تھی۔ تمام جسم برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز خاں کلب بے روح جسم مسہری پر پڑا تھا۔ ان کا چہرہ بالکل نیلا بلکہ سیاہ ہو گیا تھا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے بیوی نے زہر دیدیا۔ آن کی آن میں یہ خبر ہر طرف پھیل گئی۔ پولیس آگئی ڈاکٹر بلوایا گیا۔ اس نے عبدالعزیز خاں کی لاش کا اچھی طرح معائنہ کیا اور کہا، "کالے ناگ نے ڈسا ہے"۔ پھر بھی پولیس کو اطمینان نہ ہوا۔ لاش کسی بڑے ہسپتال میں لے گئے۔ وہاں پوسٹ مارٹم ہوا۔ اور آخر سول سرجن نے بھی یہی فیصلہ دیا کہ سانپ نے کاٹا ہے سب کو یقین آگیا۔ گوہر شاد بے گناہ قرار پائی۔ اٹھارہ مہینے کے اندر شادی بیاہ، رنڈاپا سب کچھ ہو گیا۔

اس حادثے کے دو ہفتے بعد بارسیال میں خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین کے یہاں خوشی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ بڑی دھوم دھام تھی۔ بڑی چہل پہل تھی۔ چھوٹے بڑے اپنے بیگانے، آقا، نوکر، دوست، احباب بقدر تعلق سبھی مسرور نظر آتے تھے۔ پورے اٹھارہ مہینے کی گمشدگی کے بعد ابوالحسنات سلامتی کے ساتھ یکایک گھر واپس آگیا تھا۔ ماں کی بے نور آنکھیں پھر سے روشن ہو گئی تھیں۔

بوڑھے باپ کا ٹوٹا ہوا دل پھر سے جڑ گیا تھا۔ جھکی ہوئی کمر پھر ایکبار سیدھی ہو گئی تھی۔ محمد علی خاں ہر چند کہ بیٹی کی بیوگی کے غم میں مبتلا تھے۔ پھر بھی اُنہیں ابوالحسنات کی واپسی کا حال سن کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ مگر خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین سے ان کے تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ اِس لئے مبارک باد دینے نہیں آئے۔ کس منہ سے آتے۔ اِدھر سے بھی عبدالعزیز خاں کے پُرسے کے لئے کوئی اُن کے پاس نہیں گیا تھا۔ ابوالحسنات کو گھر پہنچتے ہی دونوں خاندانوں کے تعلقات کی برہمی کا حال معلوم ہوا اور ساتھ ہی عبدالعزیز خاں کی موت کی خبر سنی تھی۔ اس نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ جیسے ہی موقع ملا فوراً محمد علی خاں کے پاس پہنچا۔ محمد علی خاں نے دیکھتے ہی اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ اور بچوں کی طرح پھُوٹ کر رونے لگا۔ ابوالحسنات سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ سارے گِلے شکوے آنسوؤں نے دھو دئے۔ جذبات کا طوفان فرو ہوا تو دونوں طرف سے استفسارِ حال کی نوبت آئی۔

محمد علی خاں نے کہا:

"ابو! تم نے سُنا! تمہاری بہن پر کیا گذری؟"

اُس نے کہا: "ہاں چچا سُنا۔ مگر خدا کی مرضی میں کسِ کو دخل ہے۔ صبر و شکر کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟ امی جان کو اس حادثے کا بڑا صدمہ ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں "جب تک عدت پوری نہ ہو جائے۔ شادی تو یہاں آ نہیں سکتی۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ چند روز کے لئے اس کے پاس سونا پور ہو آؤں۔ ذرا اُس کا دل بہل جائیگا

کچھ غم غلط ہو جائیگا۔ مگر کیوں کر جاؤں ؟"

محمد علی خاں نے کہا۔

"عدت ہی کی مجبوری سے ہم لوگ اُسے اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ مگر بھابی کو وہاں جانے سے کس نے روکا ہے ؟" کہنے کو تو محمد علی خاں نے یہ بات کہہ دی۔ مگر احساس ندامت سے اُن کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ پچھلے اٹھارہ مہینے کے تمام واقعات ایک ایک کر کے اُن کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ابوالحسنات کا پیغام۔ ان کا انکار۔ عبدالعزیز خاں سے گوہر شاد کی شادی۔ ابوالحسنات کی گم شدگی۔ خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین سے دوپشتوں کے گہرے تعلقات کا خاتمہ۔ عبدالعزیز خاں کی طویل بیماری اور پھر اچانک موت۔ گوہر شاد کی بیوگی۔ ابوالحسنات کی اچانک واپسی۔ ان سب چیزوں نے مل کر اُن کے خیالات میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:

"ابو! چلو گھر چلو۔"

ابوالحسنات کچھ کہے سنے بغیر اُن کے ساتھ ہو لیا۔

اٹھارہ مہینے کی بے تعلقی کے بعد خان بہادر ابوالخیر صلاح الدین سے محمد علی خاں کا پھر میل ہوا۔ اس مرتبہ دونوں خاندانوں کے تعلقات پہلے سے بھی کچھ زیادہ خوشگوار ہو گئے۔ عدت پوری کر کے گوہر شاد باریسال واپس آ گئی۔ جائداد کی بٹو کر دوں نے محمد علی خاں کے سارے بل نکال دیئے تھے۔ خاندانی شرافت کا واہمہ

اب ان کے دل سے یکسر محو ہو چکا تھا۔

گوہر شاد اور ابوالحسنات کی شادی کی تیاریاں دونوں طرف بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ گوہر شاد کے جمال و رعنائی کا عالم دیدنی تھا۔ خزاں دیدہ چمن میں پھر سے بہار آ گئی تھی۔ چاند گہن سے نکل آیا تھا۔ ابوالحسنات کو کائنات کا ذرہ ذرہ خوشی سے مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ کھلے بندوں گوہر شاد سے ملنے کی اسے اب بھی اجازت نہ تھی۔ مگر وہ پہلی سی پابندیاں بھی نہ تھیں۔ بزرگوں سے چشم پوشی کی توقع تھی۔ بایں ہمہ آزادی کے ساتھ، کھل کر ملنے کا موقع اب تک نہیں ملا تھا۔

پھر ایک رات آئی۔ آغاز بہار کی رومانی رات، ہوا مستیاں بکھیر رہی تھی۔ چودھویں کا چاند اپنی بھری جوانی کے جلوے لٹا رہا تھا۔ تالاب کے کنارے ناریل کے درختوں کے نیچے، ابوالحسنات آج پھر گوہر شاد کا منتظر تھا۔ گوہر شاد آئی۔ پہلے کی طرح ڈرتی جھجکتی نہیں۔ بلکہ شرماتی، لجاتی، مسکراہٹوں کے پھول برساتی آئی۔ اُسے دیکھتے ہی ابوالحسنات چند قدم آگے بڑھا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے چوم لیا۔ گوہر شاد کے گلابی رخسار شہابی ہو گئے۔ ابوالحسنات نے ایک چھوٹا سا مخملیں غالیچہ ناریل کے درخت کے نیچے بچھا رکھا تھا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ گوہر شاد کا ہاتھ اب بھی ابوالحسنات کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کی نازک اور حسین انگلیوں سے کھیل رہا تھا۔ چند لمحے خاموشی میں گذرے۔ پھر ابوالحسنات نے والہانہ انداز میں کہا:۔

"شادی! ڈارلنگ!!"

گوہر شاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر اٹھا کر ایک دلربایانہ انداز سے ابوالحسنات کی طرف دیکھا۔ اف کتنی ساحرانہ کشش تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں مسرت کے جوش سے کتنی غیر معمولی چمک اُن میں پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں اور دونوں پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ابوالحسنات نے بے اختیار، گوہر شاد کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹ اُس کے لبوں سے پیوست کر دیئے۔ گوہر شاد کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا سر پیچھے کو ڈھلک گیا۔ اُس کا بند بند کانپ اُٹھا۔

تشنہ کام روحیں ابھی سیراب نہ ہوئی تھیں کہ کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دونوں گھبرا کر جدا ہو گئے۔ دیکھا کہ ابوالحسنات کا بوڑھا ملازم منصور جس نے ابوالحسنات کو گودوں میں کھلایا تھا، حد درجہ بدحواسی کے عالم میں بھاگا چلا آتا ہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس نے گھبرا کر کہا۔

"سرکار! خدا کے لئے جلد کہیں بھاگ جایئے۔ پولیس آگئی آپ کی تلاش ہو رہی ہے۔"

گوہر شاد کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ابوالحسنات نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ ایک لمحے سناٹا رہا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اور نہایت عزم و استقلال کے لہجے میں بولا:۔

"بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تم چلو میں آتا ہوں۔ کہہ دو چند منٹ میرا

انتظار کریں۔"

بوڑھا منصور سست قدموں سے واپس ہوا۔

ابوالحسنات نے گوہر شاد سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"ڈارلنگ! یہ وقت ہمت سے کام لینے کا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ دل کو سنبھالو میں جانتا ہوں۔ پھانسی کا تختہ میرا منتظر ہے۔ مگر میرا ضمیر مطمئن ہے۔ عبدالعزیز خاں کا اصلی قاتل میں نہیں کوئی اور ہے۔ قاتل کی چھری اگر مجرم ہو سکتی ہے تو میں بھی مجرم ہوں اس سے زیادہ میری حیثیت نہیں۔ مگر انصاف کی اندھی آنکھیں اس حقیقت کو نہیں دیکھ سکتیں۔ بہر حال قدرت کو یہی منظور تھا۔ مجھے اپنی جان کا خوف نہیں۔ قلق صرف تمہاری نامرادی کا ہے۔ مگر میری جان! دنیا میں کتنے انسان ہیں جو بامراد جیتے ہیں اور بامراد مرتے ہیں۔"

ابوالحسنات کہہ رہا تھا اور گوہر شاد ٹکٹکی باندھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گویائی سلب ہو گئی تھی۔

پولیس کو پہلے دن سے شبہ تھا کہ عبدالعزیز خاں کی موت میں کچھ اسرار ہے۔ خفیہ طور پر تحقیقات برابر جاری تھی۔ آخر ثابت ہو گیا کہ جس کالے ناگ نے عبدالعزیز خاں کو ڈسا تھا۔ اُسے ابوالحسنات ہی وہاں لایا تھا۔ وہ سپیرا بھی مل گیا۔ جس نے سانپ پکڑ کے ابوالحسنات کے حوالے کیا تھا۔ وہ بانس بھی مل گیا۔ جس میں ابوالحسنات نے

سانپ کو بند کیا تھا۔ عبدالعزیز خاں کو اپنی راہ سے ہٹانے کی کوئی اور صورت نہ دیکھ کر ابوالحسنات نے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔

اس نے ایک لمبا موٹا بانس لیا۔ اسے اندر سے خالی کر کے سانپ کو اس میں بند کر دیا۔ بانس کے منہ پر کاگ کی ڈاٹ لگا دی۔ ڈاٹ میں ایک کنڈا لگا تھا۔ کنڈے میں ڈوری بندھی تھی۔ اور اس ترکیب سے بندھی تھی۔ کہ کھینچی جائے تو ڈاٹ نکل آئے اور بانس کا منہ کھل جائے۔ عبدالعزیز خاں کو رات کے کھانے میں کوئی خواب آور چیز دیدی گئی تھی۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔ گوہر شاد اس شب کو بچوں کے کمرے میں سوئی تھی۔ آدھی رات کے وقت ابوالحسنات نے اس بانس کو کھڑکی میں سے کمرے کے اندر پہنچا دیا۔ پھر اُسے عبدالعزیز خاں کے منہ کے قریب رکھ کر ڈوری کھینچ لی۔ ڈاٹ کھل گئی۔ جھلایا ہوا بھوکا سانپ تڑپ کر نکلا سب سے پہلی چیز جو اُس کے سامنے آئی وہ عبدالعزیز خاں کا چہرہ تھا۔ اسی پر منہ مارا اور ایک ہی لمحے میں اُنہیں موت کے آغوش میں سلا دیا۔

مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ابوالحسنات نے بلا پس و پیش اپنے "جرم" کا اقبال کر لیا۔ اور تمام واقعات بے کم و کاست بیان کر دیئے۔ جج سے اُس نے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ قانون کی نظر میں مَیں ہی مجرم ہوں۔ مگر انصاف اندھا ہے اس کے آنکھیں ہوتیں تو وہ دیکھتا کہ حقیقی مجرم میں ہوں یا کوئی اور۔ میری حیثیت تو صرف ایک آلہ کی سی ہے۔ جج اس کی انوکھی دلیلیں، اس کی رودادِ محبت اور اس کی

نامرادی کی داستان سنکر بے حد متاثر ہوا۔ مگر جرم ثابت تھا۔ صاف کیونکر چھوڑ دیتا پھر بھی اتنا کیا کہ موت کی سزا کو حبس دوام میں تبدیل کر دیا۔

ابتدا میں لوگوں کا خیال تھا کہ گوہر شاد کو بھی اس جرم میں کالے پانی کی سزا ملے گی۔ اور گوہر شاد نے جب سے یہ بات سنی تھی۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ لیکن بے درد قدرت کو دو محبت کرنے والی معصوم روحوں کی یکجائی کب گوارا ہو سکتی تھی۔ اگرچہ دنیا کی نظر میں گوہر شاد کے لئے کالے پانی کی سزا حد سے زیادہ سخت تھی لیکن قدرت کے نزدیک محبت ایسا معمولی جرم، ایسا معمولی گناہ نہیں جس کی پاداش فقط حبسِ دوام ہو۔ ایسے مجرم کی سزا محبوب سے دائمی مفارقت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے گوہر شاد کو گھٹ گھٹ کر جان دینے اور گھل گھل کر تمام ہونے کیلئے بری کر دیا گیا۔

سچی کہانی

سراب

رعنا اور جمیل کی شادی محبت کی شادی تھی۔ ازدواجی زندگی کے یہ دو سال اس طرح گذرے جیسے شادی کی رات اور اس سے پہلا دن رنگینیوں سے معمور مسرتوں سے لبریز حسن، جوانی اور محبت نے مل کر ان کی زندگی کو ایک رنگین کہانی بنا دیا تھا۔ رعنا کی تمناؤں کا مرکز فقط ایک ہستی تھی۔ اُس کا محبوب جمیل جمیل کی ہر آرزو کا منتہا صرف ایک ذات تھی، اس کی دل نواز رعنا۔

کہتے ہیں کہ حصولِ مقصود کے بعد دل میں خلش اور روح میں تڑپ باقی نہیں رہتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ رعنا اور جمیل کے معاملے میں شاید انسانی فطرت کا یہ قانون ٹوٹ گیا تھا۔ وہی والہانہ شیفتگی جو ایک دوسرے کے لئے شادی سے پہلے تھی، آج شادی کے دو سال بعد بھی موجود تھی۔ گفتار وکردار کا

کوئی پہلو ایسا نہ تھا۔ جو ان کی شورانگیز محبت کا آئینہ دار نہ ہو۔

اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں چلتے پھرتے یا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے۔ جیسے ہی جمیل کی نظر رعنا پر پڑتی۔ وہ بے اختیار اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ پیار کر لیتا۔ پھر دونوں بیٹھ جاتے۔ بھول جاتے کہ کون کس کام کے لئے اٹھا تھا بس وہی چاہت اور پیار کی باتیں۔ کبھی رعنا پیچھے سے آ کر اچانک جمیل کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔ وہ آہستگی سے اُس کے دونوں ہاتھوں کو کھینچ کر کبھی اپنے رخساروں سے مس کرتا، کبھی اپنے سینے پر رکھ کر دباتا۔

کبھی رعنا بیٹھے بیٹھے اُس کے کاندھے پر سر رکھ دیتی اور اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ یہاں نہیں، کسی دوسری دنیا میں ہے۔ یا خواب دیکھ رہی ہے غرض ان کی زندگی کچھ ایسی غیر معمولی ہم آہنگی کے ساتھ گذر رہی تھی۔ کہ دیکھنے والے رشک کرتے۔ حیران ہوتے اور کبھی کبھی اسے بے اصل نمائش سمجھتے۔

جمیل کسی معزز سرکاری عہدے پر ممتاز تھا۔ اپنے محکمے کا افسر تھا۔ گیارہ بجے دفتر جاتا۔ ایک بجے گھر آ کر رعنا کے ساتھ کھانا کھاتا۔ دو ڈھائی بجے دوبارہ دفتر جاتا۔ اور عموماً پانچ بجے اور کبھی کبھی ساڑھے چار بجے ہی واپس آ جاتا۔ اور پھر دوسرے دن گیارہ بجے تک عموماً دونوں ساتھ رہتے۔ رعنا کو یہ چند گھنٹوں کی جدائی بھی شاق گذرتی۔ اکثر ٹیلیفون کرتی کبھی کھانے سے پہلے، کبھی جمیل کے دوبارہ گھر آنے سے پہلے۔

"بہت جی گھبرا رہا ہے۔ اب آ جائیے نا! ہائے اللہ اب کب تک انتظار کریں۔"

"ابھی آتا ہوں میری جان! ابھی آتا ہوں، چند کاغذوں پر دستخط کرنے باقی ہیں۔"

"نہیں بس اب آجائیے۔ کل کیجئے گا دستخط نہیں تو میں خود آتی ہوں۔"

"اچھا ڈارلنگ ابھی آیا۔"

یہ تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد کبھی کبھی رعنا کسی اردو کے رسالے میں سے کوئی افسانہ یا کوئی اچھا سا مضمون پڑھ کر جمیل کو سناتی۔ پھر دونوں اس پر بحث کرتے۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے مضمون پر تنقید کرتے کرتے کبھی خود مضمون نگار پر بھی تنقید کرنے لگتے۔ دونوں نے بہت اچھا ادبی ذوق پایا تھا۔ مگر رعنا کو نظم کی بہ نسبت نثر سے زیادہ مناسبت تھی۔ اور نثر میں بھی وہ ایسے مضامین اور افسانے زیادہ پسند کرتی تھی جن میں فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز سے بحث کی جاتی یا نفسیاتی مسائل کی تحقیق ہوتی وہ ایک گمنام ادیب کی بے حد مداح تھی جو "مجذوب" کے فرضی نام سے اور "مجذوب کی بڑ" کے عنوان سے اردو کے ممتاز رسالوں میں دانش و حکمت کی باتوں سے لبریز مضامین اور نفسیات کے نازک و لطیف نکتوں سے بھرپور افسانے لکھا کرتا تھا۔

ایک رات کو کھانا کھانے کے بعد جمیل نے کہا:

"وہ آپ کے مجذوب صاحب مدت سے نظر نہیں آئے۔"

"کیا آپ کو بھی اُن کی "بڑ" پسند ہے؟"

"ڈارلنگ تم جس چیز کو پسند کرو وہ مجھے کیونکر پسند نہ ہو گی۔"

"تو پھر ابھی آپ کو سناؤں گی۔ آج ہی تو "سروش" کا سالنامہ آیا ہے۔ مجذوب صاحب نے اس میں ایک لمبی "بڑ" ہانکی ہے۔ صرف سُرخی دیکھ کر میں نے چھوڑ دیا۔ سوچا کہ آج رات کو ساتھ بیٹھ کر پڑھیں گے"۔

"تو پھر سُناؤ"۔

رعنا نے میز پر سے "سروش" کا سالنامہ اُٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔ جمیل پوری توجہ کے ساتھ سن رہا تھا۔

"مجذوب کی بڑ"

"محبت آخر ہے کیا۔ ایک جذبہ ہی تو ہے جس کا محرک جنسی میلان ہے۔ عام جنسی میلان جب شدت و افراط کے ساتھ کسی ایک ذات سے مخصوص ہو جاتا ہے تو ہم اُسے محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو سچی اور جھوٹی محبت کیسی؟ پاک اور ناپاک محبت کے کیا معنی؟

بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو قدرتی طور پر ہر چاہنے والے کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ محبوب کو تمام و کمال اپنا بنالے۔ اِس حد تک اپنا بنالے کہ کوئی آرزو تشنۂ تکمیل نہ رہنے پائے۔ مگر یہ صورت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ مذہب' اخلاق' قانون اور رسم و رواج نے بعض چیزوں کو جائز اور بعض چیزوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یہی جائز و ناجائز، کسی نہ کسی عنوان سے تکمیلِ تمنا کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں"۔

"بعض لوگوں پر مذہب کا اثر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کسی "گناہ" کے ارتکاب

کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

"بعض لوگوں کو اپنی خاندانی شرافت کا احساس، اپنے ننگ و ناموس کا لحاظ، بدنامی و رسوائی کا اندیشہ، رسم و رواج کی رکاوٹیں، ملکی قانون کی پابندیاں اور کچھ دوسری مجبوریاں۔ اقدامِ "جرم" سے باز رکھتی ہیں۔"

"بعض لوگوں کو نہ مذہب کا چنداں پاس و لحاظ ہوتا ہے نہ وہ آئینِ اخلاق کی پروا کرتے ہیں۔ نہ بدنامی و رسوائی سے ڈرتے ہیں۔ اِس کے باوجود کسی "معصیت" کے اقدام پر آمادہ نہیں ہوتے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے اندر خود جذبۂ محبت اتنا شدید نہیں ہوتا کہ وہ موانع کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالیں اور دل کی پیاس بجھالیں۔"

بعض لوگوں میں ذاتی طور پر کسی خطرے میں پڑنے کی ہمت اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اِس لئے وہ "جائز" اور "ناجائز" کے حصار میں پناہ لیتے ہیں۔

اور بعض لوگ ضبطِ نفس کی ایسی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں کہ جذبات کی آندھیوں اور خواہشات کے طوفانوں میں بھی اُن کا قدم، مذہب، اخلاق، قانون اور رسم و رواج کے قائم کیئے ہوئے جادۂ اعتدال سے نہیں ڈگمگاتا۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔

بعض لوگ امورِ محبت میں ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ یا یوں کہئے کہ اپنی جنسی بھوک کی تسکین کے لئے کبھی "ناجائز" فعل کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اِس لئے نہیں کہ یہ اشتہا انہیں ستاتی نہیں۔ یا "گناہ" کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کو اُن کا جی نہیں چاہتا یا فی الحقیقت مذہب کے مقدس احکام کا پاس و لحاظ ان کا دامن

تھام لیتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ بعض دنیوی مجبوریاں انہیں "جرم و گناہ" کے اقدام سے باز رکھتی ہیں۔ مگر وہ ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا مذہب کے احترام نے انہیں معصیت کے ارتکاب سے روکا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف دوسروں کو بلکہ بعض اوقات خود اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ احترامِ مذہب کا اظہار صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ دوسرے ان کی پاکی طینت سے متاثر اور ان کے نفس کی بزرگی کے قائل ہو جائیں۔ اور اس طرح وہ درحقیقت کسی عملِ خیر کا اقدام کئے بغیر دنیا کی نظر میں مقدس و محترم بن جائیں۔

یہ لوگ اپنی محبت کو "پاک محبت" کہہ کر اپنے دل کی چوریوں کو چھپاتے اور اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اور جو لوگ امورِ محبت میں جائز و ناجائز کی تمام قیود سے بے نیاز ہو کر دنیا و آخرت کی ذرہ برابر پروا کئے بغیر حصولِ آرزو کی خاطر ننگ و ناموس بلکہ ہر چیز کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اور تکمیلِ تمنا ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ "پاک محبت" والے انہیں گنہگار، مجرم، بدکردار وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں اور اُن کی محبت کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ "پاک محبت" اور "ناپاک محبت" کی تفریق محض بے معنی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مجبوری کی بنا پر معصیت کا اقدام نہ کر سکے لیکن اُس کا دل ارتکابِ گناہ کے لئے سراپا آرزو ہو تو کیا ہم اُسے پاک اور مقدس سمجھنے میں حق بجانب ہیں؟ پھر جب یہ بات ظاہر ہے کہ ہر حال میں وہی جنسی میلان ہے تو پاک اور ناپاک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

آج تو آپ کے مجذوب صاحب بُری طرح بہک رہے ہیں۔ پاک اور ناپاک محبت

کا فرق ہی مٹا دیا۔ گویا ہر محبت ناپاک ہے۔ کیونکہ اُس کا محرک جنسی میلان ہے۔ ناپاک محبت کسی دلیل سے بھی پاک نہیں ہو سکتی بکم سے کم میرا تو یہی خیال ہے۔" جمیل نے رعنا کے زانو پر سر رکھ کے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"یقیناً پاک اور ناپاک محبت میں فرق ہے۔ میرے نزدیک تو صرف میاں بیوی کی محبت پاک محبت کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ اس میں ہر آرزو کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے اور انسان معصیت سے محفوظ بھی رہتا ہے۔"

اگر وہ ایک دوسرے کے دل کا حال جان لینے پر قادر ہوتے تو شاید "مجذوب" کے خیالات پر تبصرہ کرنے کی اُنہیں جرأت ہی نہ ہوتی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہ محسوس کر رہے تھے۔ کہ مجذوب نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔

"جنسی میلان جائز اور ناجائز کا پابند نہیں۔ پھر محبت میاں بیوی کے درمیان کیونکر محدود رہ سکتی ہے۔ بعض مخصوص حالات کے جمع ہو جانے پر محبت کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں کسی کے ارادے اور اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ سماجی مصلحتوں کی بنا پر اگر ہم شادی کے بغیر محبت کے تقاضوں کی تکمیل نہ ہونے دیں تو یہ دوسری بات ہے۔ مگر نفس جذبہ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہر حال ایک ہی رہیگا چاہے اُسے پاک کہو۔ چاہے ناپاک کہو۔"

رعنا اور جمیل دونوں کے دلوں میں بہ یک وقت اسی قسم کے خیالات آ رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی حقیقی کیفیت کو چھپا رہے تھے۔ دونوں

کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایک کو دوسرے کے دل کا حال نہ معلوم ہو جائے۔

آخر جمیل نے کہا:

"اچھا آگے پڑھو، اور کیا فرماتے ہیں مجذوب صاحب۔"

رعنا نے پھر پڑھنا شروع کیا

یہی حال سچّی اور جھوٹی محبت کا ہے محبت نہ سچی ہوتی ہے نہ جھوٹی۔ یا یُوں کہئے کہ ہر محبت سچی ہے یا ہر محبت جھوٹی ہے۔ محبت اگر دیرپا ہو تو عموماً ہم اُسے سچّی محبت کہتے ہیں اور اگر جلد مٹ جائے تو وہ جھوٹی محبت کہلاتی ہے۔ مگر محبت کے دیر تک باقی رہنے یا جلد مٹ جانے کو اُس کے سچّے یا جھوٹے ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ اِس اختلافِ حال کا سبب کچھ اور ہے۔ فراق محبت کی زندگی اور وصال اُس کی موت ہے جس طرح منزل پر پہنچ جانے کے بعد سفر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اور حرکت سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح حصولِ مقصود کے بعد دل میں وہ خلش اور طبیعت میں وہ جوش و اضطراب باقی نہیں رہتا۔ جو حصولِ مقصود سے پہلے ہوتا ہے۔

اب اگر کسی کو محبوب تک پہنچنے کے لئے بہت سی مشکلوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا اور مدّتوں سرگرداں رہنا پڑا ہے۔ تو اُس کے جذبات میں شدت اور گہرائی نسبتاً زیادہ ہوگی۔ اور اگر یہ مرحلہ بہ آسانی طے ہو گیا تو ظاہر ہے کہ شوق کی تسکین بھی جلد ہی ہو جائے گی۔

محبت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، تکمیلِ آرزو کے بعد محبوب میں وہ کشش باقی نہیں

رہتی جو حصولِ تمنا سے پہلے تھی۔ اسی لئے محبت کی شادیاں اکثر ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ تنوع پسندی انسان کی فطرت ہے۔ اس لئے بھی کچھ مدت کے بعد طرفین کی طبیعتیں ایک دوسرے سے سیر ہو جاتی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی

چڑھی ہے یہ ندی اتر جائے گی

شادی کے بعد یا تسکینِ آرزو کے بعد جذبات کی اس چڑھی ہوئی ندی کا اترنا لازمی ہے۔ محبت کی کارفرمائی تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ بعد کی زندگی میں زن و شوہر کی ایک دوسرے سے غیر معمولی وابستگی کا سبب محبت نہیں بلکہ حالات کا تقاضا اور اجتماعی مصالح ہوتے ہیں۔ اُسے محبت کا نتیجہ سمجھنا یقیناً غلط ہے۔ محبت کی عمر اتنی دراز نہیں ہوتی ہے۔ نہ ہو سکتی ہے۔ جذبات کا ہنگامی جوش فرو ہو جانے کے بعد محبت کا ختم ہو جانا بھی لازمی ہے۔ اور یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ جب یہ صورت ہے تو سچی اور جھوٹی محبت میں فرق کر کے ایک کو سراہنا اور دوسری کو موردِ ملامت ٹھہرانا قصورِ فہم کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت ہمیں کسی وقت نہ بھولنی چاہیے کہ کسی شخص کی محبت کو ہم سچی اور پاک محبت کہیں یا جھوٹی اور معصیت آلود محبت قرار دیں اس اصل کی بہر حال وہی ایک جنسی میلان ہے اس لئے سچی اور جھوٹی یا پاک اور ناپاک محبت کے درمیان حقیقی اختلاف اور بنیادی فرق کوئی نہیں۔"

ختم کرنے کے بعد رعنا نے کہا:

"مضمون کے اس دوسرے حصّے سے تو میں قیامت تک اتفاق نہیں کر سکتی۔ کیا خود ہماری زندگی اور ہماری محبت اس کی قطعی تردید نہیں۔؟

"یقیناً" جمیل نے زور دیتے ہوئے کہا "ممکن ہے دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہو جیسا مجذوب صاحب کا خیال ہے لیکن ہمارا ذاتی تجربہ تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہماری شادی کو آج پورے دو برس ہو گئے لیکن جمیل آرزو سے کیا ہماری محبت کی شور انگیزیوں میں کسی قسم کا فرق آگیا؟"

"نہ آیا ہے۔ اور نہ انشاء اللہ جیتے جی آئے گا۔" رعنا نے جمیل کی تائید کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ سب کچھ تھا۔ مگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے حقیقت پر پردہ ڈالا ہے۔ اور قدرتی طور پر اُن کا ضمیر اُنہیں ملامت کر رہا تھا۔

"مجذوب کی بڑ" کے مطالعے سے رعنا کی طبیعت غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی تھی۔ ایک مبہم سا خوف اُس کے سارے وجود پر طاری ہو گیا تھا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ایک دوسرے کی حالت سے بیخبر۔ مگر در حقیقت دونوں کے خیالات میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور دونوں کا احساس بھی کم و بیش یکساں ہی تھا۔

رات کو دونوں بہت بے چین سوتے۔ جمیل نے ایک پریشان خواب دیکھا اور

گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ رعنا اس وقت بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے خوبصورت بال اُس کے گداز مرمریں بازوؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔ عالم خواب میں اُس کی رعنائی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ سوتے میں ایک دل نواز مسکراہٹ اُس کے رنگین لبوں پر کھیل رہی تھی۔ شاید وہ کوئی خوشگوار خواب دیکھ رہی تھی۔ جمیل کو خدا جانے کس واہمے نے گھیرا۔ اس نے رعنا کا بازو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ رعنا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ جمیل کو اپنے سامنے اور اپنا بازو جمیل کی گرفت میں دیکھ کر بہت گھبرائی۔ بظاہر تو گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی۔ جمیل نے اُسے قدرے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ بظاہر شک کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جمیل کے اس طرزِ عمل سے اُسے حیرت ہونی چاہئے تھی۔ مگر نہیں اُسے حیرت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ پریشان ہو گئی۔ وہ جمیل سے آنکھیں چار نہ کر سکی۔ جیسے اُس نے کوئی جرم کیا ہے۔ جیسے اُس کا کوئی خوفناک راز افشا ہو گیا ہے۔ دونوں پریشان تھے۔ بہت پریشان۔ بہر حال کسی طرح صبح ہوئی۔

اُسی دن کسی سرکاری ضرورت سے جمیل کو دورے پر جانا پڑا۔ شام کو پلٹنے کا وعدہ کر کے وہ رعنا سے رخصت ہوا۔ بظاہر دونوں اس طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے جس طرح دو چاہنے والے۔ ایسے چاہنے والے جن کی طوفانی محبت ہنوز تسکینِ آرزو سے محروم ہو۔

جمیل کے جانے کے بعد رعنا کی طبیعت گونہ سکون پذیر ہوئی۔ اُس نے آئینے میں اپنا منہ دیکھا۔ پھر بال درست کئے۔ بینٹ اسپرے اٹھا کر چہرے اور گردن کو معطر

کیا۔ پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اور لکھنا شروع کیا۔

"افسر! میرے پیارے! میری زندگی کی کیتا آرزو! اللہ بتاؤ یہ تم نے مجھے کیا کر دیا۔ میری پُرسکون زندگی کو طوفانوں سے بھر دیا۔ محبت میرے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں میں پہلے بھی محبت کر چکی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ محبت کے متعلق میں سب کچھ جانتی ہوں مگر اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو میں نے محبت سے تعبیر کیا تھا۔ شاید وہ محبت تھی ہی نہیں۔ دل میں یہ خلش، روح میں یہ تڑپ طبیعت میں یہ ہیجان جس سے آجکل دوچار ہوں۔ پہلے کبھی میں نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ میری آنکھیں تو خواب راحت کی خوگر ہیں۔ اور اب؟ اب تو ان میں جلن ہے۔ درد ہے۔ آنسو ہیں میں سمجھتی تھی کہ میرے لب صرف مسکراہٹوں کے لئے بنے ہیں۔ مگر آج؟ آج تو فقط پیاپے آہوں کے لئے وقف ہیں۔ پہلے تو دل سے اس طرح دھواں کبھی نہیں اُٹھتا تھا۔ اُف! رگ رگ میں بجلیاں بھر گئی ہیں سینہ نہیں آتشکدہ ہے۔ مگر کتنی لذت ہے اس طرح جلنے اور جلتے رہنے میں زندگی کی ساری راحتیں ساری مسرتیں اس سوز و گداز پر قربان ہیں۔

"افسر! یہ تم نے کیا کر دیا میری زندگی کے دھارے کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ اس چند مہینے میں میں کتنی بدل گئی۔ کیا سے کیا ہو گئی۔ اپنے انجام پر نظر کرتی ہوں تو دل لرز جاتا ہے۔ کانپ کانپ اُٹھتی ہوں۔ پروردگار! میرا حشر کیا ہوگا؟ خدا کی گنہگار۔ بندوں کی مجرم۔ نہ بزرگوں کی عزت و حرمت کا پاس نہ اپنے ننگ و ناموس کی پرواہ شرافت و غیرت کے معنی بھول گئی ہوں۔ فرائض کا احساس مٹ چکا ہے۔ جان چھڑکنے والے

شوہر کے ساتھ غداری کر رہی ہوں۔ دنیا میں تباہی۔ عاقبت میں روسیاہی۔ یہی میرے اعمال کی جزا ہو گی۔ اُف خدا!

مگر میں کیا کروں؟ آہ! جادوگر! تو نے میری روح کو تسخیر کر لیا ہے۔ میرا اختیار زبردستی مجھ سے چھین لیا ہے۔ زندگی میں اب اس کے سوا اور کوئی آرزو ہی نہیں کہ میری ہستی تیری ذات میں گم ہو جائے۔

اللہ! میں کس قدر ریاکاری برت رہی ہوں۔ اس ڈر سے کہ کہیں انہیں کوئی شبہ نہ ہو جائے، اُن کے ساتھ اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار اس شد و مد سے کرتی ہوں۔ گویا میری روح کا ذرہ ذرہ اُن کی پرستاری کے لئے بیتاب ہے۔ بناوٹی محبت کے اظہار و نمائش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتی اور میری اس مکاری کا اثر بھی اُن پر خاطر خواہ ہو رہا ہے۔ ہائے کتنے معصوم، کتنے نیک ہیں وہ، میرے فریب کو حقیقت سمجھ رہے ہیں میرے اس طرزِ عمل سے اُن کی محبت، ان کا اعتماد، ان کا خلوص پہلے سے ہزار گونہ بڑھ گیا ہے۔ میں یقین کے ساتھ جانتی ہوں کہ انہوں نے میرے سوا زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی۔ محبت تو بڑی چیز ہے۔ کسی کے ساتھ انہیں معمولی وابستگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کی مسرتوں کا سرچشمہ، اُن کی آرزوؤں کا مرکز، اُن کی زندگی کی کل کائنات صرف ایک میری ذات ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر جیتے ہیں۔ دو گھنٹے کے لئے دفتر جاتے ہیں۔ اور گھر آتے ہیں تو میرے لئے اس طرح بیتاب جیسے مدت سے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے انہیں میری جدائی گوارا نہیں۔ ذرا دیر کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہوں

فوراً چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کہیں انہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ میں
۔ ۔ ۔ ۔ آہ۔ یا تو خدانخواستہ ان کا دماغ اُلٹ جائے یا وہ خودکشی کر لیں۔

اب تک میں یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کرتی تھی۔ کہ اگر میں نے اُن کے سوا کسی دوسرے سے محبت کی تو میرا اس میں کیا قصور؟ محبت تو ایک اضطراری جذبہ ہے جس میں اختیار کو دخل نہیں۔ پھر محبت تو یکسر معصوم ہے۔ مادی آلودگیوں سے بالکل پاک۔ اس کا تعلق تو فقط روح سے ہے۔ جسم سے نہیں۔ میرا جسم تو بہرحال انہیں کا ہے محض روحانی محبت تو گناہ نہیں ہو سکتی اِس سے نہ مذہب کا قانون ٹوٹتا ہے نہ اخلاق کا۔ نہ سوسائٹی کے نظام میں اس سے خلل پڑ سکتا ہے۔ نہ کسی کی حق تلفی ہوتی ہے۔ غرض میں ہمیشہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دیتی رہی کہ میری محبت پاک اور معصوم ہے مگر "سردش" کے سالنامے میں "مجذوب کی بڑ" کے عنوان سے تم نے محبت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر رات میری آنکھوں سے پردے اُٹھ گئے۔ میں نے پاک معصوم اور روحانی محبت کا جو ایک سربفلک محل چنا تھا۔ وہ آنِ واحد میں مسمار ہو کر رہ گیا۔ کیا تمہارے لئے میری شیفتگی محض جنسی میلان کا نتیجہ ہے؟ نہیں افسر! ایسا نہ کہو۔ للہ ایسا نہ کہو۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔

میں تو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس پر آمادہ نہیں ہوئی۔ کہ اپنا جسم تمام و کمال تمہارے حوالے کر دوں۔ میں اِسے گناہ، جرم اور خیانت سمجھتی رہی اور سمجھتی ہوں مگر میں اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی۔ کہ میری انتہائی آرزو یہی تھی اور اِس وقت

بھی یہی ہے کہ میری ساری ہستی تمہاری ذات میں گم ہو جائے۔ تم میرے سارے وجود پر کچھ اس طرح چھا گئے ہو۔ میرے قلب و روح کے ذرّے ذرّے میں اِس طرح سما گئے ہو۔ کہ میں تمہارے بغیر اپنی جداگانہ ہستی کا تصوّر ہی نہیں کر سکتی۔ میرے اللہ مجھ پر رحم کر مجھے اس تباہی سے بچالے۔

تم نے سچی اور جھوٹی محبت کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خیال کر کے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کیا لازمی طور پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ تمہارا دل مجھ سے بھر جائے گا۔ آہ افسر! کیا تم رعنا سے اُسی رعنا سے جسے اپنی زندگی کی یکتا آرزو کہتے اور سمجھتے ہو۔ بیزار ہو جاؤ گے؟ خدا نہ کرے کہ میں اس ناقابلِ برداشت روحانی عذاب کو جھیلنے کے لیے اس دنیا میں زندہ رہوں۔ کاش جس وقت میرا جسم پہلی بار تمہارے آغوش میں آسودہ ہو۔ شدتِ مسرت سے اُسی وقت میری روح پرواز کر جائے۔ اگر میری آرزو پوری ہو جائے تو میں سمجھوں کہ میں نے اپنے حاصلِ زندگی کو پالیا۔

محبت کو زندہ رکھنے اور پائدار بنانے کی تدبیر بھی تم نے بتا دی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ "فراق محبت کی زندگی اور وصال اس کی موت ہے۔" تو پھر کیوں نہ ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے جدا رہیں؟ قرب کی نوبت ہی کیوں آئے جو محبت کو صدمہ پہنچے۔ مگر آہ۔ یہ بھی تو اب میرے اختیار میں نہیں۔ برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ شکیبائی کی اب تاب نہیں۔ افسر! تمہاری جادو گر آنکھوں کی قسم! جدائی کی اذیت اب موت کی اذیت سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر موت کی اذیت تو فقط آنی ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں گذر جاتی ہے

مگر یہ عذاب تو میری روح پر مستقل ہے کب تک اس جاں کنی کے عالم میں گذاروں۔ میں
تو آخری فیصلہ کر چکی ہوں۔ تمہارے قرب کی چند روح پرور ساعتوں کے بدلے میں
اگر مجھے ابدی عذاب کے شکنجے میں مبتلا ہونا پڑے تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ اگر
میں تمہیں صرف اتنی دیر کے لئے پا سکوں کہ اپنی روح کی تڑپ اور دل کی جلن تمہیں دکھا
سکوں تو خدا کی قسم! دنیا سب کچھ کھو کر، سب کچھ مٹا کر ان ساعتوں کو خریدنے کے لئے
بخوشی آمادہ ہوں۔

رات میں نے تمہیں خواب میں دیکھا کس طرح؟ یہ نہیں بتاؤں گی۔ میں کس قدر خوش
تھی۔ اچانک انہوں نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ جس وقت ہماری آنکھیں
چار ہوئیں۔ میں سہم کر رہ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ
دیکھ لیا ہے۔ ان کی آنکھوں سے بدگمانی ٹپکتی تھی۔ میں لرز گئی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔
خدانخواستہ اگر کہیں سچ مچ وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیں تو کیا ہو۔ اُف خدا۔

تمہارے مضامین اور افسانے وہ بھی بے حد پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ رات
انہوں نے کہا "وہ آپ کے مجذوب صاحب مدت سے نظر نہیں آئے۔" اس پر میں نے
تمہارا مضمون پڑھ کر انہیں سنایا اور دیر تک ہم اس پر اظہار خیالات کرتے رہے۔ میں
نے جھوٹ موٹ تمہارے خیالات کی تردید کی۔ انہوں نے سچے دل سے میری تائید کی۔
مگر ایک بات ہے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ خدانخواستہ انہیں مجھ پر کسی قسم کا کوئی شبہ
ہے۔ لیکن جب کبھی تمہارا ذکر آتا ہے یا تمہارا کوئی مضمون پڑھ کر انہیں سناتی ہوں تو وہ

کچھ پریشان سے ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے اس کا کیا سبب ہے۔؟

آج وہ باہر گئے ہیں۔ شام کو واپس آئیں گے۔ اگلے ہفتے انہیں کسی سرکاری کام سے چند روز کے لئے کلکتہ جانا ہے۔ راستے آج کل محفوظ نہیں۔ سفر میں خطرہ ہے۔ پھر کلکتہ میں خود قتل و خون کا بازار گرم ہے۔ اس لئے مجھے ساتھ نہیں لیجا رہے ورنہ پہلے تو کبھی مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں گئے۔ دورے پر بھی ہمیشہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک بار میں نے کہا تھا: "اس میں آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے" انہوں نے کہا: "ہاں کچھ زحمت تو ضرور ہوتی ہے۔ مگر کیا کروں۔ ایک لمحے کے لئے بھی تم سے دوری کسی حال میں گوارا نہیں"

تو مطلب میرے لکھنے کا یہ ہے کہ آئندہ اتوار کے بعد کئی دن میں بالکل تنہا ہونگی۔ بالکل تنہا اور بالکل آزاد۔ زندگی میں ایسا موقع شاید پھر کبھی نہ آئے گا۔ شاید کیا یقیناً نہیں آئے گا۔

اللہ! کیونکر کٹیں گے انتظار کے یہ آٹھ دن اور آٹھ راتیں۔ ملاقات کے تصور ہی سے میرا تمام جسم سنسنا رہا ہے۔ جوش مسرت سے دل کا عجب عالم ہے! اچھا خدا حافظ۔

تمہارے لئے سراپا آغوش

تمہاری اپنی رعنا

جس وقت رعنا نے یہ خط لکھ کر تمام کیا، جمیل ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ

میں اکیلا، خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ ریل تیزی سے اڑی چلی جارہی تھی۔ اُس نے اپنا اٹیچی کیس کھول کر پنسل اور کاغذ نکالا اور ایک خط کا مسودہ تیار کرنا شروع کیا۔

"جس نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے روشناس کیا جس نے مجھے دل کا درد اور روح کا گداز بخشا جس نے میری زندگی کو چاندنی، پھولوں اور نغموں کا مجموعہ بنا دیا میں اُسے کیا کہہ کر خطاب کروں؟ اُس کے نام سے زیادہ خوبصورت کوئی لفظ مجھے معلوم ہی نہیں۔

"شہلا" کتنا پیارا۔ کتنا رومانی۔ کتنا شاعرانہ نام ہے۔ ادھر قلم سے یہ لفظ نکلا؛ اُدھر دو غزالی آنکھیں سامنے آگئیں۔ آنکھیں نہیں مستیوں کے دو قرابے۔ قرابے نہیں مستیوں کے دو سمندر۔

شہلا! کتنا خوش نصیب ہے۔ وہ انسان جو تمہارے جسم کا مالک ہے مگر پھر سوچتا ہوں کہ جسمانی مسرتیں تو بہت ہی بے ثبات۔ بہت ہی ناپائدار ہوتی ہیں۔ اُس سے کہیں زیادہ خوش قسمت تو میں ہوں۔ جسے تم نے اپنی روح کی خلوتوں میں جگہ دی ہے۔

تم اندازہ نہیں کرسکتیں شہلا کہ تمہارا خط پاکر فرطِ مسرت سے میرا کیا حال ہوا۔ مگر اس خیال سے مجھے بے حد اذیت ہے۔ کہ تم آج تک میری بے قیاس محبت کو شک کی نظر سے دیکھتی ہو۔ رعنا کی محبت کے طعنے آخر کب تک دیئے جائیں گے۔ رعنا کے حسن و جمال کا آئینہ دکھا کر کب تک مجھے بہلایا .   بلکہ بہکایا جائے گا۔ رعنا کی والہانہ پرستاری کا ذکر کرکے کب تک مجھے شرمندہ کیا جائے گا۔

نہ میں نے کوئی بات تم سے چھپائی۔ نہ کسی حقیقت سے انکار کیا۔ پھران الجھنوں سے کیا حاصل۔ بیشک مجھے رعنا سے محبت تھی۔ بیشک لوگ رعنا کو تم سے زیادہ حسین کہتے اور سمجھتے ہیں۔ بیشک رعنا آج بھی مجھے ایک بت کی طرح پوجتی ہے۔ مگران تمام باتوں سے یہ حقیقت تو نہیں مٹ سکتی۔ کہ تمہاری ساحرانہ آنکھوں کی بے پناہ کشش نے مجھے رعنا سے چھین لیا۔ قصور نہ تمہارا ہے۔ نہ میرا۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ نوشتہ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے؟ یہی ہونا تھا۔ جو ہوا۔

کیا میں نے تمہیں لڑکپن میں نہیں دیکھا تھا؟ کیا میں نے تمہیں جوانی میں نہیں دیکھا تھا؟ کیا تمہاری اور رعنا کی شادی میں میری کوششوں کو دخل نہیں؟ کیا آج سے تین سال پہلے یہ ممکن نہ تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لیتا؟ مگر جھوٹی خوشامد مجھے پسند نہیں۔ درحقیقت اُس وقت میں نے کبھی تمہارے اندر کوئی خاص کشش کوئی خاص جاذبیت محسوس ہی نہیں کی تھی۔ تمہاری جادوگر آنکھوں کی ساحرانہ کشش کا پہلے پہل مجھے اُس دن احساس ہوا۔ جب تم اور رعنا بڑے دن کی چھٹی میں چند روز کے لئے ہمارے یہاں آئے تھے۔

مجھے یکا یک ایسا معلوم ہوا جیسے میری آنکھوں سے پردے اُٹھ گئے۔ اُس دن تم وہ شہلا نہ تھیں جسے میں نے اُس دن سے پہلے سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ اُف! تمہاری سیاہ آنکھوں کی بے پناہ کشش میرے لئے قیامت ہوگئی۔ میرا دل بے اختیار تمہاری طرف کھنچنے لگا۔ اور دو تین ہی دن میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے

قریب ہو گئے۔

تم مجھے رعنا کی محبت کے طعنے کیا دیتی ہو۔ کیا خود تم نے کبھی نیاز سے محبت نہیں کی؟ کیا اُس دن تک تمہیں نیاز سے محبت نہیں تھی۔ پھر اُس دن کیوں بے اختیار تمہارا دل جمیل کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ جمیل بھی تو تمہارے لئے بنا نہ تھا۔ تم نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن کیا محبت کی نظر بھی چھپ سکتی ہے؟ جو بات تمہاری زبان نے مجھ سے نہیں کہی۔ وہ تمہاری آنکھوں نے مجھے بتا دی۔ دلوں کی خاموش گفتگو آنکھوں ہی کے ذریعہ تو ہوا کرتی ہے۔

شہلا! تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ کہ یہ چار مہینے میں نے کس ذہنی خلفشار میں گذارے ہیں۔ خدا شاہد ہے تمہارے خطوں کا سہارا نہ ہوتا تو شاید مجھے جنون ہو جاتا یا کوئی مہلک مرض میرا خاتمہ کر دیتا۔ میری مصنوعی زندگی ایک زبردست فریب، ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ میں حد سے زیادہ رعنا سے محبت کا اظہار کرتا ہوں۔ اور بے حد شرمندہ ہوتا ہوں۔ وہ معصوم بھولی لڑکی جس نے دنیا میں آنکھ کھول کر صرف مجھی کو چاہا۔ مجھی کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنایا۔ جس کی والہانہ شیفتگی، بے کنار محبت اور پرستارانہ خلوص کی مثال مشکل سے ملے گی۔ جب محبت کے جذبے سے بے اختیار ہو کر اپنی ساری ہستی کو میرے اندر جذب کر دینا اور میری روح میں سما جانا چاہتی ہے تو میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اُس کی پُر شور محبت اور پُر خلوص فریفتگی کے جواب میں کم سے کم اتنی ہی سرگرمی کا اظہار کروں جو بھی درحقیقت صرف اُسی کیلئے

مخصوص تھی۔

ڈرتا ہوں کہ میری طرف سے اظہارِ محبت میں کمی ہوئی اور خدا نخواستہ اسے میرے متعلق ذرا بھی شبہ ہوگیا تو اس کا نازک دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ اس صدمے کو ہرگز برداشت نہ کر سکے گی۔ یقیناً کچھ کھا کے سو رہے گی۔ یہ سب قسمت کی ستم ظریفیاں ہیں۔ بہرحال ہم واقعات سے گریز نہیں کر سکتے۔ ان کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا جی چاہے اسے معصیت کہو۔ جی چاہے جرم کہو۔ جی چاہے برا ہی کہو۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور بری طرح چاہتے ہیں میرے بغیر تمہاری زندگی بے کیف اور تمہارے بغیر میرے لئے جینا ایک مستقل عذاب ہے۔

مانا کہ رعنا خوبصورت ہے۔ تمہارے بقول تم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے مگر شہلا! حسن دراصل نام ہے پسند کا۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ :۔ ع

مجھ کو تو تم پسند ہو' اپنی نظر کو کیا کروں

تو میں اپنی نظر کو کیا کروں۔ تمہارے سوا اب مجھے دنیا میں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ خدا جانے اس خوفناک محبت کا انجام کیا ہوگا۔ شہلا! صبر و برداشت کی قوت اب بالکل ختم ہو چکی ہے۔ للہ درمیان سے یہ غیریت کے حجاب اٹھا دو۔ اور میری تشنہ کام روح کو نوشِ حیات پلا کر تحیت اور زندگی کو جاودانی بنا دو۔

اگلے اتوار کو میں کلکتہ آ رہا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار اسے اکیلا چھوڑ رہا ہوں جانتا ہوں کہ تنہائی میں وہ بے حد گھبرائے گی۔ اور میری یاد اسے بہت ستائے گی

مگر کیا کروں۔ مجبور ہوں۔۔ اچھا جان آرزو! آئندہ دوشنبے تک رخصت۔ بہت سا پیار آج فقط زبانی اور اس دن ملنے پر سچ مچ۔ خدا حافظ۔"

تمہاری آرزو میں جینے والا

تمہارا ہمیشہ تمہارا

جمیل

سچی کہانی

نوشین

میں کانپور سے ڈھاکے آرہا تھا۔ گاڑی بہت لیٹ تھی۔ اسٹیشن پر انتظار کرتے کرتے جی اکتا گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے ٹانگیں دکھ گئیں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے وحشت ہونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے پل پر سے آدمیوں کا ایک غول چلا آتا ہے۔ آگے آگے ایک دیوانہ، اس کے ارد گرد کچھ لڑکے، کچھ قلی دو چار سفید پوش اُسے چھیڑتے، ستاتے، تالیاں بجاتے چلے آتے ہیں۔ قریب آکر اس نے مجھے فوجی طریقے سے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ وہ خوش ہوا، ٹھہر گیا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ ملایا۔ اُس نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا:

"کتنا شریف دل قدرت نے آپ کو دیا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ اس کی ہیئت ظاہری کو دیکھ کر کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی۔ کہ وہ اس درجہ شائستگی کے ساتھ گفتگو کر سکتا ہے۔ سر پر ایک پرانی، پھٹی ہوئی میلی کچیلی، انگریزی ٹوپی۔ اس میں کوؤں اور طوطوں کے کئی پر لگے ہوئے پھٹا ہوا قمیص، جس کی ایک آستین سرے سے ندارد۔ فوجی خاکی پتلون۔ صد درجہ ڈھیلی بالکل دریدہ بریدہ، ہاتھ میں ایک پتلی سی لکڑی۔ اس کے سرے پر رنگ برنگ کی کئی دھجیاں بندھی ہوئی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ٹال جو گاڑی والے اکثر اپنے بیلوں کے گلے میں باندھتے ہیں۔ خط بڑھا ہوا۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح الجھے ہوئے لمبے لمبے بال۔ ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے۔

غرض میں حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے کہا۔ شاید آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر آج سے پہلے میری آپ کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ میں اور بھی مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایک صاحب میرے شناسا مسٹر رام سروپ قریب ہی بنچ پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ دیوانے نے اُن سے کہا۔ "بابو صاحب! کیا خبر ہے؟" مسٹر رام سروپ نے مذاق کے طور پر اخبار اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ملاحظہ فرمائیے۔"

دیوانے نے اخبار لے لیا، اُلٹ پلٹ کر ادھر اُدھر سے دیکھا۔ پھر بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ ہم سب دنگ رہ گئے۔ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟" میں نے کہا میں تو پردیسی ہوں، یہاں کسی

کو نہیں جانتا۔ اس نے کہا خیر مضائقہ نہیں۔ میں خود ہی بتا دوں۔ میں پاگل ہوں۔ آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو ان عقلمندوں سے پوچھ لیجئے جو اپنے سارے کام چھوڑ کے میرے پیچھے پھرتے ہیں۔ کیوں بھئی میں ہوں نا پاگل۔ دو تین لڑکے چلّائے۔ دیکھو ہاں تم ایک دم پاگل۔ پھر اس نے کہا۔ اب اجازت ہو تو ایک بات آپ سے پوچھوں۔ میں نے کہا ضرور پوچھئے۔ کہا۔ آپ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں کچھ یونہی سا۔ کہا معاف کیجئے آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ کی صورت، آپ کا لباس، آپ کا لب و لہجہ صاف بتا رہے ہیں کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ دیکھئے یہ بات تو ہم نے پہلے ہی آپ کو بتا دی کہ ہم دیوانے ہیں۔ مگر دیوانہ ہر وقت دیوانہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک ہوشمند ہر وقت ہوشمند نہیں رہتا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں۔ جب وہ بالکل پاگل ہو جاتا ہے۔ جب جی چاہے آپ خود اپنے اوپر تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔

ہاں وہ اصل بات تو رہ ہی گئی۔ جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاگل کسے کہتے ہیں۔ میں نے کہا آپ کا سوال بہت مشکل ہے۔ کہا اچھا میں اسے آسان کئے دیتا ہوں۔ یہ بتایئے کہ ایک عاقل اور دیوانے میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا۔ میری عقل تو کچھ کام نہیں کرتی۔ کچھ آپ ہی فرمایئے۔ کہا ٹھیک ہے۔ اس وقت آپ پر دیوانگی کا غلبہ ہے۔ اچھا سنئے اور ہمیشہ یاد رکھئے۔ دیوانے اور عاقل کی ایسی جامع و مانع اور مختصر تعریف زندگی میں کبھی کسی سے نہ سنئے گا

دیکھئے جو لوگ (اکثریت) Majotitv میں ہیں وہ عاقل و دانا

ہیں اور جو لوگ (اقلیت) minority, میں ہیں وہ دیوانے ہیں اتنا ہی فرق ہے عقل و جنون میں۔ اب دیکھئے! ہم لوگ جو دیوانے کہلاتے ہیں۔ ایک خاص طریقے سے سوچتے ہیں۔ ایک خاص انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ ایک خاص وضع سے زندگی گذارتے ہیں۔ مگر ہماری تعداد بہت مختصر ہے یعنی ہم شدید قسم کی اقلیت Hopeless minority میں ہیں۔ اسی لئے ہم دیوانے ہوئے۔ اس کے برعکس آپ لوگ جو ہمارے طریق کار کے قائل نہیں۔ اور ہمارے معمولات زندگی کو پسند نہیں کرتے، آپ کی تعداد بہت کثیر ہے یعنی آپ زبردست اکثریت Over whelming majority میں ہیں۔ لہذا آپ عاقل ٹھہرے۔

آپ جانتے ہیں کہ شروع شروع میں جب پیغمبر اسلام نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی تو لوگوں نے انہیں دیوانہ کہا۔ کیوں؟ اسلئے کہ وہ minority (اقلیت) میں تھے مگر رفتہ رفتہ جب بہت سے لوگ ان کے پیرو اور ہم خیال ہوگئے، وہ ان کی majority, (اکثریت) ہوگئی تو وہی لاکھ داناؤں سے دانا سمجھے جانے لگے۔ غرض یہ سارا چکر Majority. (اکثریت) اور Minority (اقلیت) کا ہے۔ عقل و جنون بجائے خود کوئی چیز نہیں۔"

دیوانے کی دلچسپ باتوں میں ہم لوگ اس قدر محو ہوئے کہ گاڑی آپہنچی۔ اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔ گاڑی میں وہ بھی ہمارے ساتھ سوار ہوگیا۔ اتفاق سے اسی درجے

میں میرے ایک پُرانے رفیق شیام سُندر دہلی سے آ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ مسٹر شیام سُندر کو اردو سے عشق ہے۔ شعر کا بھی ذوق رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے فارسی نہیں آتی۔

دیوانے کو چھوڑ کر اس درجے میں کل پانچ آدمی تھے۔ ایک میں، ایک مسٹر رام سروپ، ایک شیام سندر، ایک پنجابی جوان اور ایک اس کی نسبتاً کم سن مگر نہایت قبول صورت بیوی۔ نیچے کی دو سیٹوں پر وہ دونوں اپنے بستر ے لگائے لیٹے تھے۔ تیسری سیٹ پر شیام سندر کا قبضہ تھا۔ مجھے اور مسٹر رام سروپ کو اوپر کی سیٹیں ملی تھیں۔ ہم لوگوں نے اپنے اپنے بستر اوپر بچھا دیئے ہیں شیام سندر کی سیٹ پر اور مسٹر رام سروپ پنجابی جوان کے برابر بیٹھ گئے۔

شام ہو رہی تھی، دیوانہ خاموش، ایک کونے میں دیوار سے پیٹھ لگا کر زمین پر بیٹھ گیا گاڑی چل پڑی۔ میں نے شیام سندر سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا۔ شیام! یہ دیوانہ عجیب وغریب انسان ہے تم اس کی باتیں سنو تو حیران رہ جاؤ۔ پھر میں نے دیوانے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اچھا حضرت' یہ تو فرمایئے آپ جا کہاں رہے ہیں"

دیوانے نے نہایت سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"منزل تو سب کی ایک ہی ہے۔ مگر نادان انسان سمجھتا نہیں" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے شیام سندر سے کہا: "دیکھا شیام" انہوں نے کہا واقعی یہ شخص کوئی غیر معمولی انسان ہے۔ پھر ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ دیوانہ خاموش تھا۔ آخر میں نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"حضرت خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ باتیں کیجیے۔ آپ کی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے۔"

اُس نے کہا: ہاں، دیوانوں کی باتوں سے عقلمندوں کی تفریح ہو جاتی ہے۔ مگر یقین کیجیے عقلمندوں کی احمقانہ باتیں بھی دیوانوں کے لئے کچھ کم دلچسپی کا باعث نہیں ہوتیں۔ پھر یکایک چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

میں نے کہا ذرا بلند آواز سے پڑھیے۔ ہم لوگ بھی سنیں۔ اُس نے کہا آپ فارسی جانتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ تھوڑی سی جانتا ہوں۔ اُس نے گلا صاف کر کے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا:

زندہ در عشق چساں بود نصیبی مجنوں
عشق آں روز مگر ایں ہمہ دشوار نہ بود

اس کی آواز میں غضب کا سوز، بلا کا درد تھا۔ سن کر لطف آ گیا۔ مسٹر رام سروپ نے مجھ سے کہا: "اس کا مطلب کیا ہوا؟"

دیوانے نے کہا: "یہ کیا بتائیں گے اس کا مطلب۔ اس کا مطلب ہم سے سنیے نظم میں کہیں کہ نثر میں؟"

اُنہوں نے کہا: "جیسی آپ کی مرضی۔"

دیوانے نے یہ شعر پڑھا۔

عشق میں زندہ رہا مجنوں یفیلیؔ کس طرح
عشق شاید اُن دنوں ایسا بہت مشکل نہ تھا

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کہ یہ فی البدیہہ اور برجستہ ترجمہ سن کر مجھے کتنا لطف آیا۔ شیام سندر بھی حیران رہ گئے۔ انہوں نے بے اختیار کہا۔ "کیا خوب۔" مسٹر رام سروپ بولے: "مجنوں یفیلیؔ" کیا؟

دیوانے نے کہا: "معلوم ہوتا ہے آپ کچھ ہم سے بھی گئے گذرے ہیں۔ ارے صاحب یفیلی شاعر کا تخلص ہے تخلص کے معنی جانتے ہیں آپ؟ اچھا جانے دیجئے۔ آپ اِس طرح پڑھئے۔

عشق میں زندہ رہا مجنوں خدایا کس طرح
عشق شاید اُن دنوں ایسا بہت مشکل نہ تھا

ہر لمحہ میری حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ شخص یقیناً کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ اِنسان ہے۔ اور غالباً کسی شدید ذہنی صدمے نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ فارسی شعرا کے منتخب اشعار کی ایک قلمی بیاض شیام سندر نے نکالی۔ اور کہا دیکھنا بھیّا یہ کتاب ایک جگہ سے

ہاتھ آئی ہے۔ سوچ رہا تھا۔ کہ کلکتہ سے تمہیں بھیجوں گا۔ میں نے جیسے ہی درمیان سے اس بیاض کو کھولا۔ یہ شعر نظر پڑا۔

مالذّتِ حیات زغفلت نیا فتیم

چوں نشۂ شراب کہ درخواب بگذرد

بے اختیار میں نے کہا۔ سبحان اللہ کتنی پیاری بات کہی ہے۔ اور تشبیہہ کتنی نادر ہے۔ اور پھر ذرا بلند آواز سے میں نے اس شعر کو دہرایا۔ دیوانہ جیسے چونک پڑا۔ بڑے غور سے سننے لگا۔ شیام سندر فارسی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے کہا ذرا اردو میں اس کا ترجمہ تو کیجئے۔ میں نے کہا ترجمے سے شعر کا سارا لطف خاک میں مل جائے گا۔ بہرحال اس کا مطلب یہ ہے کہ :-

میں یہیں تک کہنے پایا تھا کہ دیوانہ بولا۔ یہ بات نہیں، ترجمہ اچھا ہو تو لطف کم نہیں ہوتا۔ ذرا پڑھئے تو اس شعر کو۔ میں نے پھر ایک بار اُسے دُہرایا۔

دیوانے نے ٹھہر ٹھہر کر کئی بار پڑھا۔ پھر بولا۔ اُردو میں اس طرح کہہ سکتے ہیں

غفلت میں کٹے عمر تو جینے کا مزہ کیا

پی کر کوئی سو جائے تو پینے کا مزہ کیا

میں اور شیام سندر دونوں جھوم گئے۔ مَیں نے کہا۔ شیام خدا کی قسم۔ یہ ترجمہ اصل سے بڑھ گیا ہے۔ اس میں غضب کا ترنم ہے۔ پھر میں نے دیوانے سے مخاطب ہو کر کہا۔ واللہ آپ نے تو کمال کر دیا۔ اُس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اپنی دھن میں

مسنت اِس شعر کی تکرار کرنے گیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

میں نے دوبارہ اُس سے مخاطب ہو کر کہا معلوم ہوتا ہے۔ آپ شاعر بھی ہیں، اور ماشاءاللہ بہت اونچے درجے کے شاعر۔

وہ بڑے غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

شاعر؟ جی ہاں شاعر۔ بہت بڑا شاعر۔ کالی داس، نظامی، شیکسپیر، تمام استادوں کے استاد۔ اور آپ کو معلوم ہے اِن سب شاعروں نے ہمارے ہی قصّے تو لکھے ہیں۔ مَیں نے کہا وہ کس طرح؟ یہ سب لوگ تو مختلف زمانوں میں گزرے ہیں اور آپ سے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے گذرے ہیں۔ اس نے کہا مختلف زمانوں میں گزرے ہیں تو کیا ہوا۔ ہم بھی تو مختلف زمانوں میں گزرے ہیں۔ اس مجنونانہ جواب پر میں ذرا مسکرایا۔ اُس نے کہا معلوم ہوتا ہے آپ خاک نہیں سمجھے۔ آپ جانتے ہیں نَل وہ کون تھا؟ میں ہی تو تھا۔ شکنتلا ناٹک میں دشینت کون تھا؟ میں ہی تو تھا۔ اور شکنتلا کون تھی؟ میری شیریں ہی تو تھی۔ پھر وہی جولیٹ بنی اور آج وہی نوشین۔ میں حیرت سے اُس کا منہ تک رہا تھا۔ مسٹر رام سروپ، شیام سندر اور وہ دونوں نوجوان پنجابی میاں بیوی، سب کے سب دیوانے کی باتوں میں محو تھے۔ میرے سوا باقی سب ہندو تھے۔ اور تناسخ (آواگون) کے قائل۔ اس لئے اِن باتوں کو وہ بڑی دلچسپی سے سُن رہے تھے۔

میں نے کہا "اچھا فرہاد صاحب اب آپ کیا ہیں؟"

اس نے کہا۔ میں آج بھی فرہاد بنا ہوا ہوں۔ مشکلات کا ایک سر بفلک پہاڑ میرے اور نوشین کے درمیان حائل ہے۔ بارہ برس سے میں اس پہاڑ کو کاٹ رہا ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے اس پہاڑ کو کاٹ کر اس میں ایک سرنگ بنائی۔ اور میں نوشین کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا۔ کہ میرے ہونٹ اس کے لبوں کو چھو سکتے تھے۔ مگر اس زندگی میں ایسا قرب صرف ایک بار ہی نصیب ہوا۔ دوسری بار جب میں نوشین سے ملنے جا رہا تھا۔ سرنگ گر پڑی۔ راستہ بند ہو گیا۔ میں بری طرح زخمی ہوا۔ مگر بچ گیا۔ اسی کا افسوس ہے۔"

پھر اس نے اپنی ٹوپی اتار کر سر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے زخم کا نشان اب تک موجود ہے۔ اور یہ میری انگلیاں دیکھیے۔ یہ دونوں بھی اسی حادثے میں ٹوٹ گئی تھیں۔ چھوٹے بڑے دو زخم آئے تھے۔ دل کے زخم اس میں شامل نہیں۔"

واقعی اس کے سر پر زخم کا ایک بڑا سا نشان تھا۔ انگلیاں بھی بالکل ٹوٹی ہوئی تو نہیں مگر کچلی ہوئی، ٹیڑھی اور معیوب ضرور تھیں۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ بارہ برس ہونے آئے۔ آج تک مشکلات کے اس پہاڑ کو کاٹ رہا ہوں۔ مگر کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ سرنگ کاٹتا ہوں راستہ کچھ آگے بڑھتا ہے پھر سرنگ گر پڑتی ہے۔ راستہ مسدود ہو جاتی ہے۔ امید نہیں کہ اس زندگی میں نوشین کو دوبارہ دیکھ سکوں۔ خیر مضائقہ نہیں۔ شاید دوسرے جنم میں۔ شاید دس بیس جنم کے

کے بعد ہم پھر ایک دوسرے کو پا لیں اور اپنا بنا لیں۔ زندگی کا چکر اسی طرح چلتا ہے۔"

ہم سب بے انتہا دلچسپی کے ساتھ اس کی یہ مجنونانہ باتیں سن رہے تھے۔

میں نے کہا اچھا آپ کی نورعین اب کہاں ہے؟ اس نے ایک ٹھنڈا سانس کھینچی اور کہا۔ جب وہ شیریں تھی۔ خسرو پرویز کی قید میں تھی۔ آج جب کہ وہ نورشین ہے ایک دوسرے جابر کے پنجے میں گرفتار ہے۔ زندگی کا چکر اسی طرح چلتا ہے۔" پھر وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ نوجوان لڑکی پر ایک غلط انداز سی نظر ڈالی۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر گنگنانے لگا :-

سیاہ بختی ازاں بیشتر نمی باشد

کہ مجلس دگرے روشن از چراغ من است

دیوانے کی خیالی یا شاید اصلی داستان سننے کے بعد یہ شعر مجھے اس قدر برمحل معلوم ہوا کہ میں پھڑک اٹھا۔ میں نے کہا: ماشاء اللہ کیا قیامت کا شعر پڑھا ہے۔ شیام سندر نے کہا ہمیں بھی سنایئے۔ میں نے کہا۔ تمہیں کیا سناؤں۔ افسوس تم فارسی نہیں جانتے ورنہ یہ شعر شاید عمر بھر نہ بھولتے۔ جو داستان تم نے ابھی سنی ہے یہ شعر گویا اس کا خلاصہ ہے شاعر کہتا ہے کہ اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہوگی۔ کہ میری شمع سے دوسرے کی محفل روشن ہے۔

دیوانے نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایک اچھے شعر کو آپ نے غارت کر دیا۔ سیہ بختی کا ترجمہ بدنصیبی کیا۔ شمع اور مجلس اور روشنی کی مناسبت سے سیہ بختی ایک ایسا لفظ

ہے جس کا بدل اِس جگہ کوئی دوسرا لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمہ ہی کرنا تھا تو اس طرح کرتے :۔

ہم سا جہاں میں کوئی نہ ہوگا سیاہ بخت
روشن ہے بزمِ غیر ہمارے چراغ سے

مَیں نے اور شیام سُندر نے بیک وقت کہا۔ واہ وا کیا خوب کہا۔ باقی تینوں مسافر بھی دیوانے کی باتیں اور اشعار سُن سُن کر مبہوت ہوئے جا رہے تھے۔

میں نے کہا فرہاد صاحب! کاش میں بھی آپ کی طرح شاعر ہوتا۔ دیوانے نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا مجھ جیسے شاعر ہوتے تو میری طرح دیوانے بھی ہوتے۔ کوچہ و بازار میں رسوا بھی ہوتے شکر کیجئے کہ آپ مجھ جیسے شاعر نہیں۔

پنجابی لڑکی کانوں میں ہیرے کے ٹوپس پہنے ہوئے تھی۔ صرف ایک ایک دانہ۔ ممکن ہے ہیرے نہ ہوں پکھراج ہوں۔ کیونکہ دانے خاصے بڑے بڑے تھے۔ اس کے گلابی رخساروں پر ہیروں کی جوت عجیب بہار دکھا رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے شیام سندر کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور کہا اِس منظر کو دیکھ کر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔ شیام سندر نے کہا سنایئے میں نے یہ شعر پڑھا۔

بُناگوش میں اُس کے الماس پارہ
فروزندہ جیسے شفق میں ستارہ

شیام سندر نے کہا۔ خدا کی قسم کمال کر دیا۔ کیا پیاری تشبیہہ ہے۔ ہائے

بھائی جب سے تم نے دلی چھوڑی، ان چیزوں کیلئے کان ترس گئے۔

دیوانے نے کہا۔ آپ نے یہ مضمون غالباً اس شعر سے اڑایا ہے۔

نمود گوہر سیراب در بُنا گوشش

چو شبنمے کہ کشد برگ گل در آغوشش

میں نے کہا "سبحان اللہ کیا خوب شعر ہے۔ مگر حضرت میں نے تو آج سے پہلے یہ شعر کبھی سُنا ہی نہیں۔ پھر مضمون اڑانے کا سوال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے" اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہا! "آپ ناحق شرمندہ ہوتے ہیں۔ ارے صاحب مضمون چرانا تو شاعروں کی پرانی عادت ہے۔ ہمیشہ ایک دوسرے کا مضمون چراتے آئے ہیں۔ آپ نے کونسی نئی بات کی۔ اور یہ بھی صحیح نہیں کہ آپ نے یہ شعر آج پہلی بار سُنا ہے۔ سنا پہلے بھی ہوگا یا کہیں پڑھا ہوگا۔ آپ کو یاد نہیں رہا۔ مضمون دماغ میں تھا۔ اسی سے آپ نے یہ شعر پیدا کیا۔ مضمون کا انداز اور "بناگوش" کا لفظ صاف چغلی کھا رہا ہے۔

اور مجھے کس قدر حیرت ہوئی۔ جب کئی مہینے کے بعد میں نے یہ شعر اپنی بیاض میں لکھا ہوا دیکھا۔ اور دیوانے کی یہ بات یاد آئی۔

شیام سُندر نے کہا بھیّا اس کا مطلب کیا ہوا؟ میں نے کہا شاعر کہتا ہے۔۔۔۔

میں اتنا ہی کہنے پایا تھا۔ کہ دیوانہ بولا۔ آپ کو ترجمہ کرنا نہیں آتا۔ ناحق شعر کو تباہ نہ کیجئے۔ بابو صاحب اس کا مطلب یہ ہوا۔ ۔ ۔ یہ کہہ کر اس نے سر جھٹ،

کی طرف اُٹھایا۔ آنکھیں بند کیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک عجیب انداز سے حرکت دی اور کوئی ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد بولا۔

گوہر تابندہ ہے اُس کے بناگوش میں
قطرۂ شبنم ہے یا پھول کے آغوش میں

یہ منظوم ترجمہ سُن کر مجھ پر دیوانے کا بے انتہا رعب پڑ گیا۔ میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ ضرور تدا اس دیوانے میں کسی بڑے شاعر کی روح حلول کر گئی ہے۔ یا کوئی جن یا فرشتہ ہے یا کوئی پہنچا ہوا درویش ہے۔ اس کا علم و فضل۔ اس کا ذوق شعری اس کے عجیب و غریب خیالات اس کی بے انتہا دلچسپ کہانی اور پھر یہ دیوانگی، یہ جنوں، آخر یہ سب کیا اسرار ہے؟

دیوانے سے مخاطب ہو کر میں نے کہا۔ سبحان اللہ کتنا مکمل اور حسین ترجمہ کیا ہے۔ شیام سندر نے بھی تعریف کی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُس نے ہماری باتیں سنیں ہی نہیں۔ وہ خاموش تھا۔ اور برابر چھت کو تکے جا رہا تھا۔ گاڑی فتح پور پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے کھانا نکالا۔ دیوانے سے پوچھا۔ آپ بھی کھائیں گے؟ اس نے کہا۔ بھوک دیوانوں کو بھی لگتی ہے۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ اور ایک رکابی میں کچھ کھانا اُسے دیا۔ مگر اُس نے کھانے کی طرف کوئی اعتنا نہ کی۔ رکابی وہیں زمین پر رکھی رہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ خدا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے کئی بار کہا۔ کہ حضرت کھانا کھائیے۔ مگر اُس نے نہ تو کھانا کھایا۔ نہ میری بات کا جواب دیا

بس چھت کی طرف تکے جا رہا ہیں نے شیام سندر نے ساتھ کھانا کھایا۔ اور ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد پنجابی جوڑے نے بھی کھانا کھایا۔ مسٹر رام سروپ کھانا کھا کر اپنی سیٹ پر اوپر جا لیٹے۔ پنجابی نوجوان اپنی سیٹ چھوڑ اپنی بیوی کے پاس آ بیٹھا۔ بیوی کھسک کر اور بھی اس کے قریب ہو گئی۔ آہستہ آہستہ وہ اختلاط کی باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی بار بار مسکرا رہی تھی۔ پروانے اس رات کو بہت تھے۔ لیمپ پر چھائے ہوئے تھے۔ دیوانہ خاموش بڑے غور سے لیمپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جوان نے خدا جانے کیا بات کہی لڑکی بے اختیار ہنس پڑی۔ اور اس نے اپنی گردن جوان کے شانے پر رکھ دی۔ دیوانہ چونکا دونوں پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر پتنگوں کا رقص دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

میں نے کہا فرہاد صاحب کچھ باتیں کیجئے۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور نہایت دردناک آواز میں گنگنانے لگا۔ کسی شعر کی تکرار کر رہا تھا۔ الفاظ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میں نے زیادہ غور سے سننے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ اُس کی آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ اب شعر صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔

شمع و گل و پروانہ و بلبل ہمہ جمع اند
اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

رات کا وقت۔ شمع پر پروانوں کا ہجوم۔ نوجوان جوڑے کا باہم اختلاط و

اس ماحول میں یہ مناسب حال شعر طبیعت بہت ہی متاثر ہوئی۔ اور میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ شیام سُندر نے کہا۔ بھیا چپ کیوں ہو گئے؟ میں نے کہا اس ظالم نے جادو کر دیا ہے۔ شیام نہ پوچھو کس قیامت کا شعر ہے۔ جو یہ پڑھ رہا ہے۔ اور کس قدر برمحل ہے۔ اور اگر یہ اس کی آپ بیتی بھی ہے تو اور بھی قیامت ہے۔ شیام سندر نے کہا۔ اُردو میں اس کا مطلب بتاؤ تو کچھ سمجھ میں آئے۔ میں نے کہا اب میں ترجمہ کی جرأت نہ کروں گا۔ اسی سے کہتا ہوں۔ دیکھیں اس مرتبہ وہ ترجمے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔

میں نے کہا۔ فرہاد صاحب! وہ چونک پڑا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ آپ جانتے ہیں ترجمہ کرنے کا مجھے سلیقہ نہیں۔ میرے دوست کی خواہش ہے کہ آپ اس شعر کا ترجمہ کر دیجئے۔ دیوانے نے ایک انگڑائی لی۔ لڑکی پر ایک نظر ڈالی پھر پروانوں کی طرف دیکھا۔ ایک سرد آہ کھینچی اور بولا:۔

شمع و پروانہ ہیں یکجا، گُل و بُلبل ہیں بہم

رحم! اے دوست! خدا را مری تنہائی پر

اہلِ ذوق ہی اس امر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ماحول میں اس شعر نے سننے والوں پر کیا اثر کیا ہو گا۔ اور پھر پڑھنے والے کی دردناک آواز اور خوش آہنگی ہم دونوں بہت ہی لطف اندوز ہوئے۔

میں اُس دن بہت تھکا ہوا تھا۔ میں نے کہا شیام! تم اوپر میرے بستر پہ چلے

جاؤ۔ میں یہیں سوؤں گا۔ شیام نے کہا اچھی بات ہے اور وہ اوپر چلے گئے۔ میں پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ روشنی گل کر دی گئی۔ چاند نکل آیا تھا۔ ہر طرف چاندنی ہی چاندنی تھی ہمارے ڈبے کے اندر بھی آسمانی چراغ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

دیوانہ میرے بالکل قریب ہی بیٹھا تھا۔ کھانا اُس نے نہیں کھایا۔ میں نے رکابی اُس کے پاس ہی رکھی رہنے دی۔ کہ جب بھوک لگے یا اس کا جی چاہے کھا لے۔ وہ کبھی خاموش ہو جاتا۔ اور چھت کی طرف تکنے لگتا۔ کبھی آپ ہی آپ مسکرانے لگتا۔ کبھی گنگناتا۔ کبھی خود بخود باتیں کرنے لگتا۔ اور باتیں بھی عجیب و غریب قسم کی کبھی مسلسل گفتگو کبھی بالکل بے ربط اور بے معنی۔ آخر تھوڑی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔ ریل میں عموماً مجھے نیند بہت کم آتی ہے۔ مگر اس رات کو بہت سویا اور بے خبر سویا۔ جس وقت میری آنکھ کھلی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دو شخص آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں جو صرف ناز و نیاز کی خلوتوں میں رازدارانہ طور پر کی جاتی ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید جوان پنجابی جوڑا سرگرمِ اختلاط ہے۔ مگر نہیں آواز دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ دیوانہ گاڑی کی دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ اُس کے گھٹنوں کے گرد حلقہ کئے تھے۔ اُس کی آنکھیں چھت سے لگی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر وہ تو اکیلا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ میں نے ابھی ابھی کے بعد دیگرے دو شخصوں کو بولتے سنا تھا۔ ہاں میرا خیال غلط نہ تھا۔ دیوانے نے یکا یک اپنا لہجہ بدل دیا۔ اب تو ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ خود نہیں بول رہا ہے بلکہ

پوری توجہ سے سُن رہا تھا۔ اُس نے کہا

"فرہاد۔ میرے پیارے۔ میری روح کے مالک۔ میرے خوابوں کے دیوتا۔ میری بیداریوں کے بہشت۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو۔ میں تمہاری خیریت . . . .

کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد اپنی اصلی آواز میں پھر بولا۔

"نوشین! جانِ آرزو! پروانہ جلتا ہے۔ جلتا ہے جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ مگر کیا وہ کبھی شمع سے آزردہ بھی ہوتا ہے؟ آزردہ ہوتا تو اس آتش سوزاں پر قربان کیوں ہوتا؟ اس کا طواف کرتے کرتے جل کر ختم ہو جانے کو حاصلِ زندگی کیوں جانتا؟ نوشین، سوچو تو سہی۔ کب ہماری محبت کا آغاز ہوا۔ کتنے ہزار برس گزر گئے۔ کتنے جنم بیت گئے۔ یاد ہے محبت کا وہ ابتدائی زمانہ جب تم نے ایران کی شاہزادی شیریں کا پیکر اختیار کیا تھا تو کیا فرہاد نے اُس وقت تمہارے لئے جان نہیں دی تھی؟ پھر جب تم نے جولیٹ کے روپ میں جنم لیا تو کیا تمہارے فرہاد نے رومیو بن کر اپنی زندگی تمہارے قدموں پر نثار نہیں کی تھی۔ اور آج جب کہ تم نوشین کے بھیس میں نمودار ہوئی ہو تو کیا تمہارا فرہاد بارہ برس سے مشکلات کے پہاڑ نہیں کاٹ رہا ہے؟ اور میری حالت . . . . میری حالت . . . . میری حالت تم کیا جانو، کس حال میں رکھے۔ سال دو سال پہلے جس نے مجھے دیکھا ہے اب وہ مجھے پہچان نہیں سکتا۔ اللہ میں کتنا بدل گیا ہوں یا دنیا ہی بدل رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ تم بھی مجھے نہ پہچانو تو کیسی قیامت ہو۔ آہ نوشین . . . ."

اس کے بعد اُس نے جو کچھ کہا۔ اُس کا سر پاؤں کچھ میری سمجھ میں نہ آیا ہے ترتیب

بے ربط جملے بے معنی الفاظ۔ اس بے سروپا گفتگو کا جو حصہ مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے۔

اس نے کہا۔

" نوشین تم نہیں جانتیں۔ اُف خونریز لمحے۔ سر جبالوں کی طرح تیر تے پھرتے تھے اور پھر وہ گندگی، پیپ۔ وہ مریض کی کھانسی اور اُس کا تھوک۔ ہارت۔ مارت زور سے بہت زور سے۔ اُفوہ۔ اور پھر دوسرے دیو بھی ہیں۔ دیوتا۔ فرشتے۔ پیغمبر۔ دیوانے سنتا کیسے بہت روئیگا۔ عمر بھر روئے گا۔ آہ منحوس رات۔ کپڑوں کی دھجیاں دھجیاں۔ جسم کے پُرزے پُرزے۔ خاک و خوں میں شرابور۔ اُف خدا۔ آہ نوشین! اس وقت بھی میرا دل لرز رہا ہے۔ کلیجہ کانپ رہا ہے۔ آہ تم پر کیا گزری ہوگی اُس وقت "

کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔ میں حیرت میں غرق۔ اُس کا ایک ایک لفظ غور سے سُن رہا تھا۔ اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب مجذوب کی بڑ ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔

وہ پھر یکایک بولا۔ اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔

" آہ نوشین! تمہیں اُس "بہشت ارضی" میں بھی چین نصیب نہ ہوا۔ تم مضطرب ہی رہیں اپنے دیوانے کے لئے۔ اپنے محبوب کیلئے۔ اور تم نے خط بھی لکھا۔ ہائے افسوس وہ صحیفۂ محبت مجھے ملا بھی نہیں۔ اللہ۔ جدائی کے یہ بارہ برس۔ اور پھر زندگی میں کبھی ملنے کی آس نہیں۔ خدایا رحم کر۔ نہیں نوشین! للہ تم اس قدر مایوس نہ ہو۔ اور وہاں یہ تم نے کیا کہا کہ "جسے میں اپنا، صرف اپنا سمجھتی تھی، کلیتہً اپنا سمجھتی تھی۔ آج میں اُسے خط بھی

مکمل تو دوسروں کی معرفت۔ کیا خدا کی شان ہے۔" نوشین! وہ دور گزر گیا۔ ساری مصلحتوں کو میں نے زمین کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ اب میں دنیا میں کسی بات کا اندیشہ نہیں کرتا۔ تم مجھے خط لکھو۔ ضرور لکھو۔ بے دھڑک لکھو۔ براہِ راست لکھو میرے نام۔ ہاں میرے نام لکھو۔ اور ہاں وہ خط جو لکھا رکھا ہے۔ مدت سے لکھا رکھا ہے۔ وہ بھی بھیجنا، جلد بھیجنا۔ کتنا انتظار ہے مجھے اس خط کا۔ اور دیکھو۔ . . . "

پھر یکایک اس نے ذرا بلند آواز سے کہا۔" ہیں! تم جا رہی ہو؟ نوشین! نوشین! تم جا رہی ہو؟"

میں اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے بلند آواز سے کہا۔" او خدا! وہ چلی گئی۔ میری زندگی۔ میری نوشین!"

میں نے جلدی سے بٹن دبا دیا۔ درجے میں روشنی ہو گئی۔ وہ نہایت مضطرب تھا۔ چہرے سے سخت وحشت برس رہی تھی۔ اس نے غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ اندر جھانکا جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ پھر زور سے بند کر دیا۔ اور فرش پر گھٹنے ٹیک کر پنجابی لڑکی کی سیٹ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ وہ سخت بدحواس نظر آ رہا تھا۔ وہ پھر ایک بار چلایا۔ "نوشین! آہ نوشین! تم کہاں چلی گئیں۔"

روشنی اور شور سے باقی چاروں مسافر بھی جاگ اٹھے۔ مجھ سے پوچھا کیا ماجرا ہے۔ میں نے کہا۔ شاید اس پر جنون کا دورہ پڑا ہے۔ اس نے ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک

دو تین چکر لگائے۔ باہر جھانکا اور زور زور سے پکارا: "نوشین! نوشین! ٹھہرو! میں بھی آرہا ہوں۔ ابھی آرہا ہوں۔" اور ہمارے دیکھتے دیکھتے دروازہ کھول آندھی کی طرح چلتی ہوئی ریل میں سے باہر کود گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "ارے" پنجابی لڑکی نے چیخ ماری ہم سب بدحواس ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ پنجابی لڑکی نے اپنے شوہر سے کہا۔ زنجیر کھینچو۔ زنجیر کھینچو۔ جوان نے جلدی سے اٹھ کر زنجیر کھینچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے چلتی رہی۔ یا تو زنجیر میں کچھ خرابی تھی یا گھبراہٹ میں جوان کے ہاتھ نے کام نہ دیا۔ بہرحال شیام سُندر نے زور لگایا تب زنجیر کھنچی اور جلد ہی گاڑی ٹھہر گئی۔ پھر بھی حادثے کے مقام سے دو ڈیڑھ میل نکل گئی تھی ہم لوگ اُتر پڑے۔ گارڈ کو سب حال بتایا۔ گاڑی آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ چاندنی نہ ہوتی تو اندھیرے میں کچھ پتا ہی نہ چلتا۔ بہرحال پٹڑی سے کچھ دور دیوانہ خاک و خون میں آلودہ بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کے سر میں بھی چوٹ آئی تھی۔ اور چہرہ بھی زخمی تھا۔ اُٹھا کر اُسے گاڑی میں ڈالا گیا پسپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا کہ گاڑی گیا جنکشن پر پہنچی۔

معلوم ہوا دیوانہ قیدِ حیات و بندِ غم دونوں سے ایک ساتھ آزاد ہو گیا۔ اس کی لاش پولیس کی حفاظت میں ہسپتال بھیج دی گئی۔

میرا دل اس حادثے سے اس قدر متاثر، اس قدر رنجیدہ تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جس وقت میں گاڑی میں سوار ہونے لگا۔ ہمارے برابر والے ڈبے میں سے کسی

کے گانے کی آواز آئی۔ بہت ہی پُرسوز آواز تھی میں نے اُدھر بڑھ کر دیکھا۔ ایک شخص نیم برہنہ گیروا تہمد باندھے ہاتھ میں اِکتارہ لئے اپنی دُھن میں مست دنیا و مافیہا سے بے خبر جھوم جھوم کر گا رہا تھا:-

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سُنئے گا
پڑھتے کسی کو سُنیئے گا تو دیر تلک سر دھُنیئے گا

یہ شعر میں نے پہلے بھی سُنا تھا اور پڑھا بھی تھا۔ مگر دل اتنا متاثر کبھی نہیں ہوا تھا میں خود سارا دن اسی شعر کو گنگناتا رہا۔ رات کو بھی کئی بار بے اختیار دُہرایا۔ اور اب جب کبھی یہ شعر کان میں پڑتا ہے یا نظر سے گزرتا ہے تو آنِ واحد میں دیوانے کا وہ اندوہناک حادثہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور سچ یہ ہے کہ زندگی میں اس قسم کا اِنسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب اس کا خیال آتا ہے تو دل بے حد مغموم ہو جاتا ہے خدا جانے کس روح فرسا اندوہ نے اُسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اُس کے جوشِ جنوں کا وہ آخری نظارہ اور اُس کا وہ حسرت ناک انجام مجھے آج تک نہیں بھولا۔ اور نہ شاید زندگی میں کبھی بھولے گا!

سچی کہانی

افسانہ کیونکر بنتا ہے؟

(نوٹ:۔ لکھنے والے نے یہ افسانہ جس طرح کہا تھا میں نے تقریباً لفظ بلفظ اُسی طرح لکھا ہے۔ خطوں کے مسودے موجود تھے۔ اُن میں کوئی تصرّف نہیں کیا گیا)

پریم پجاری

یہ چودہ پندرہ برس کی بات ہے۔

چھوٹے ماموں جان کی شادی تھی۔ دیسی پردیسی مہمان بہت آئے تھے۔ زنانہ میں عورتیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اور اپنی باتوں میں ایسی مشغول کہ قیامت گذر جائے اور انہیں خبر نہ ہو۔ کسی نہ کسی ضرورت سے مجھے بار بار زنانخانہ کے دروازہ پر جانا پڑتا تھا۔ دس۔ دس پندرہ منٹ چیختا تو اندر خبر پہنچتی۔ کبھی کبھی مجبور ہو کر میں دو قدم اندر گھس جاتا۔ جن بیبیوں کو اپنے پردے کا زیادہ خیال ہوتا۔ وہ یا تو سامنے سے

ہٹ جاتیں یا منہ پر دوپٹہ کا آنچل ڈال لیتیں۔ بعض کو اپنی باتوں میں خبر بھی نہ ہوتی۔ کہ کون آیا اور کون گیا۔ بعض دیکھ کر بے پروائی کے ساتھ منہ پھیر لیتیں۔ اور بعض آنکھیں چار ہونے کے باوجود اس طرح اطمینان سے ملبیٹھی رہتیں۔ جیسے ہم کوئی گائے بیل ہیں ظاہر ہے کہ گائے بیل سے کون پردہ کرتا ہے!

ایک مرتبہ میں پردہ اُٹھا کر اندر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ سامنے سے ایک نازک اندام لڑکی اچانک۔ بالکل میرے قریب آ گئی۔ سامنا ہوتے ہی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اور دوڑ کر دالان میں چلی گئی۔ میں ہکا بکا جہاں تھا۔ وہیں رہ گیا۔ کاش میں بیان کر سکتا کہ کہ میں نے کیا دیکھا۔ یا جو کچھ میں نے دیکھا کاش دوسروں کو دکھا سکتا۔ بھولی بھالی صورت پیارا پیارا نقشہ۔ گوری گوری رنگت۔ کالی کالی آنکھیں۔ نازک نازک جسم لچکتی ہوئی اس طرح سامنے سے گذر گئی جیسے پھولوں کی ڈالی تیز ہوا سے جھوم جاتی۔ غالباً کوئی تین چار منٹ تک میں بالکل مبہوت جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ آخر سنبھلا اور واپس آیا۔ یہ بالکل بھول گیا۔ کہ میں وہاں کس کام سے گیا تھا۔ جلد ہی مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہے۔ شاید اسی کیفیت کو شاعروں کی زبان میں "دل آنا" یا "دل ہاتھ سے جانا" کہتے ہیں۔

میں نے اپنے تصور کی مدد سے پھر اُس تصویر کو ایک بار دیکھنا چاہا۔ مگر خدا جانے کیوں ایک بہت ہی دھندلا سا خاکہ میرے سامنے آیا۔ ایک چیز البتہ نمایاں تھی۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کس قدر خوبصورت کس قدر روشن۔ سیاہی کتنی سیاہ سفیدی

کتنی سفید۔ خدا جانے قدرت نے انہیں کہربا سے بنایا تھا۔ یا مقناطیس سے۔ تصور میں بھی تو دل ان کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ کسی شاعر نے اپنی محبوبہ کی آنکھوں کی تعریف اس طرح کی ہے۔

یہ انکھڑیاں خدایا   کس قہر کی حسیں ہیں
کاجل نہیں لگایا   ویسے ہی سُرمگیں ہیں
آفاق کی نظر میں   تسخیر ہیں یہ آنکھیں
عشاق کی نظر میں   تقدیر ہیں یہ آنکھیں
بس کہربائیت کی   تفسیر ہیں یہ آنکھیں
روحِ نسائیت کی   تصویر ہیں یہ آنکھیں
جادو ہے نام اِن کا   کہتے ہیں موہنی بھی
شغلِ مدام اِن کا
افسوں بھی، رہزنی بھی

کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ کہ اگر شاعر نے وہ آنکھیں دیکھی ہوتیں جو میری نظر میں ہیں۔ تو اُسے ماننا پڑتا کہ آنکھوں کی تعریف میں ابھی بہت کچھ کہنے کو باقی ہے۔ وہ آنکھیں نہیں بجلیوں کے خزینے تھیں۔ مستیوں کے ساگر تھیں۔ کشش کا مرکز تھیں۔

اس طرح میں نے محبت کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ مگر خدا کیلئے کوئی بتائے۔ میری

خواہش یا میرے ارادہ کو اس میں کیا دخل تھا۔ ہاں بعد میں جو کچھ ہوا۔ اُس کا ایک حد تک میں ذمہ دار کہا جا سکتا ہوں۔ مگر اس کی مثال بھی ایسی ہے جیسے کسی کو شراب پلا دی جائے۔ اور پھر وہ لڑکھڑا کر گرے تو اُسے قصور وار ٹھہرایا جائے۔

میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ میری چھوٹی بہن زبیدہ کی پیاری سہیلی شاہدہ تھی۔ شاہدہ اس کا اصلی نام نہیں۔ میرا رکھا ہوا ہے۔ وہ اپنی والدہ کے ہمراہ بارہا ہمارے یہاں آئی تھی۔ مگر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایف۔ اے۔ کے دوسرے سال میں تھی۔ شعر کہنے کا اُسے خاصہ سلیقہ تھا۔ "پنہاں" اُس کے تخلص کا فارسی ترجمہ ہے۔ زبیدہ کی معرفت ایک مرتبہ اُس نے اپنی ایک نظم پر مجھ سے اصلاح بھی لی تھی۔ شاہدہ کے والد تعلیم کے حامی ہوتے ہوئے بھی پردہ کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ اس بارہ میں اُن کا مبالغہ اور وہم جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ خدا جانے جھوٹ یا سچ۔ مگر اُن کے متعلق مشہور تھا۔ کہ وہ کوّوں کو اپنی دیوار پر نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ بندوق سے مار دیتے تھے۔ کہ شاید ان میں کوئی نر ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی نر کوّا دیوار پر آ بیٹھے گا تو عورتوں کی بے پردگی ہو گی۔ ایسی صورت میں اپنے گھر کے سوا۔ اور وہ بھی چوری چھپے کہیں اور شاہدہ کو ایک نظر دیکھ لینا بھی میرے لئے ناممکن تھا۔

میں نے کوشش کی۔ شاہدہ اور اس کی والدہ کی آمد و رفت ہمارے یہاں رہ گئی۔ عام طور پر جس کمرے میں یہ لوگ آ کر بیٹھتے تھے۔ وہ میرے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ درمیان میں دروازہ تھا۔ میں نے کواڑ میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر لیا۔ شاہدہ جب

اس سہ راخ کے مقابل سے گذرتی یا سامنے بیٹھی ہوتی تو میں اُسے دیکھ سکتا تھا شاہدہ کو بار بار دیکھنے سے میری طبیعت اور بھی زیادہ متاثر ہو گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا شاہدہ سے اپنی محبت کا جواب لیکر چھوڑوں گا۔

شاہدہ اب تک میرے خیالات اور میرے ارادوں سے بالکل ناواقف تھی لاکھ سوچتا تھا۔ مگر شاہدہ کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔ تمام حالات کو دیکھتے ہوئے میں کسی قسم کی پیشقدمی کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ اتفاق سے ایک دن شاہدہ نے زبیدہ سے رسالہ ہزار داستان منگا بھیجا میں نے ہمت کر کے چپکے سے۔ فہرست مضامین والے صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا ؎

یوں نام کو "پنہاں" ہے شعروں سے نمایاں ہے
یہ ہوش ربا کوئی غارت گر ایماں ہے

رسالہ جب واپس آیا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ شعر ربڑ سے مٹا دیا گیا تھا۔ پندرہ دن گذر گئے۔ شاہدہ پھر ہمارے یہاں آئی۔ اس کے دو روز بعد زبیدہ نے مجھ سے کہا: "بھائی جان! آپ نے ہزار داستان دیکھ لیا ہو تو شاہدہ کو بھیج دیں۔ پرسوں وہ کہہ گئی تھی" میں نے کہا: "آج نہیں کل" در اصل میں رسالہ دیکھ چکا تھا۔ مگر بات کچھ اور تھی۔ اسی رات کو میں نے یہ غزل کہی :-

کہتے ہوئے ڈرتا ہوں جو کچھ مجھے کہنا ہے

وہ کاش سمجھ لیں خود جو میری تمنّا ہے
اب جرم کہو اس کو، یا شوق کی بیتابی
سو مرتبہ چھپ چھپ کر میں نے تمہیں دیکھا ہے
مشتاق نگاہوں سے کیا حاصلِ رُو پوشی
ہاں دیدۂ دل سے بھی چھپ جاؤ تو پڑا ہے

آئینہ میں دیکھو تو طوفانِ شباب اپنا
یوں ہی مرے سینہ میں محشر نہیں برپا ہے
آنکھیں ہیں کہ مستی کے سرشار قرابے ہیں
سینہ ہے کہ فتنوں کا دریا اُمنڈ آیا ہے

ہاں تیرے ہی دامانِ عصمت کی قسم "پنہاں"
تو ہی دلِ شیدا کی معصوم تمنّا ہے

یہ اشعار فقط ایک پردہ تھے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں غزل گوئی۔ در اصل نثر میں یہ باتیں کہنے کی میری مجال نہ تھی۔ بہر حال یہ اشعار ایک پرزہ پر لکھے اور اسے ہزار داستان کے فہرست مضامین والے صفحہ پر چپکا کر احتیاط کے ساتھ شاہدہ کے پاس بھجوا دیا۔ تین چار دن کے بعد جب رسالہ واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ پُرزہ اس

میں سے چھڑا لیا گیا تھا۔

دو مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں اسی طرح ہر رسالے میں چند شعر بھیجد یتا تھا ــــ وہ پرزہ رسالہ میں سے نکال لیتی تھی۔ اس اثنا میں شاہدہ کئی مرتبہ ہمارے یہاں آئی۔ ہر مرتبہ اس کی محبت کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہو جاتا تھا۔ میری بے تابیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے شاہدہ کو خط لکھنے کا تہیہ کر لیا۔ انجام کا اب مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ اور تھا بھی تو جذبات کے طوفان میں بالکل دب گیا تھا۔ کچھ لے دے کر شاہدہ کے گھر کی ملازمہ "جمن کی ماں" کو ہموار کیا۔ اور اُس کے ہاتھ یہ خط بھیجا۔

"جانِ آرزو! اللہ میری اس گستاخی کو معاف کر دینا۔ میں نے بالکل مجبور ہو کر خطاب کی جرأت کی ہے تمہیں کیونکر بتاؤں کہ جس دن سے تمہیں دیکھا ہے میرے سینے کے اندر کیسا حشر برپا ہے۔ خدا شاہد ہے میں نے بہت کوشش کی کہ یہ خیال میرے دل سے نکل جائے۔ مگر اس کا کیا علاج۔ کہ تمہاری خیالی تصویر ہر وقت آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ راتیں جس بے چینی سے کٹ رہی ہیں بس کیا بتاؤں۔ رات پچھلے پہر جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی۔ تمہارے پیارے خیال سے باتیں ہوتی رہیں۔ شاید تم پوچھو کہ آخر میں کیسا چاہتا ہوں پیاری! تمہاری جادو گر آنکھوں کی قسم مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ پھر تمہیں کیا بتاؤں۔ بس اتنا جانتا ہوں۔ کہ سینہ میں

ایک آگ سی بھر گئی ہے۔ دل میں ایک خلش ہے پیہم، ایک تڑپ ہے مسلسل۔ کسی طرح سکون نصیب نہیں۔ خدارا مہرِ خاموشی کو توڑیئے۔ اور چند کلمے اپنے پیارے ہاتھ سے لکھ کر بھیجیے۔ کہ بے چین زرح کچھ تسکین پائے اور مضطرب دل کو قرار آئے پنہاں! انہیں اپنی محبوب ترین شے کی قسم! جواب ضرور دینا ورنہ میرے دل کا خون ہو جائے گا۔"

فقط تمہارا پرستار

کئی دن تک انتظار کیا۔ مگر جواب نہ آیا۔ ان دنوں کی وحشت اور بیکلی۔ اللہ اکبر! صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا قیامت تھا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں آتے تھے۔ کبھی کہتا۔ بھولی بھالی معصوم، ناتجربہ کار لڑکی۔ ایک بیگانہ مرد کو کیونکر خط لکھے اور کیا لکھے۔ ڈرتی ہوگی۔ ہچکچاتی ہو گی۔ شرماتی ہوگی۔ کبھی خیال آتا کہ میرا خط بہت گستاخ تھا کہیں اُس نے بُرا نہ مانا ہو۔ بگڑ نہ گئی ہو۔ ایسا ہوا تو قہر ہوا۔ کیونکر اسے مناؤں گا۔ کس طرح راہ پر لاؤں گا۔ کون اس نامراد دل کی اس سے عذر خواہی کریگا۔ ہائے کیا کروں۔ کبھی یہ خوف کہیں کسی سے کہہ نہ دے۔ کہیں میرا خط اپنے والد کو نہ دکھا دے ایسا ہوا تو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ جب ان خیالات کا ہجوم ہوتا۔ تو دل کی کچھ عجب کیفیت ہو جاتی زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ سر چکرا تا۔ معلوم ہوتا کہ جی بیٹھا جاتا ہے۔ پھر خود ہی خیال آتا کہ نہیں۔ کچھ بھی سہی۔ شاہدہ اتنی بے درد تو ہرگز نہیں ہو سکتی کہ ساری دنیا کی نظروں میں مجھے ذلیل کرے۔ اِس خیال سے دل

کو کچھ ڈھارس ہوتی ، مگر پھر گھڑی بھر کے بعد وہی وحشت ۔ وہی اضطراب ، وہی ہراس ، کیا کہوں ، کیسی اذیت کے ساتھ وہ پانچ دن کٹے ۔ جمن کی ماں کی معرفت میں نے پھر جواب کا تقاضا کیا ۔ اگلے دن وہ یہ جواب لائی کہ انہوں نے کہا ہے ۔

"خدا جانے آپ نے کیا لکھا ہے ۔ میں کچھ نہیں سمجھی ۔"

اسی دن میں نے یہ دوسرا خط لکھا :۔

"پنہاں ! کیا واقعی تم مجھے اس قدر بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں تمہارے قول کو باور کر لوں گا ۔"

"خدا جانے آپ نے کیا لکھا ہے بس کچھ نہیں سمجھی ۔" تم اور نہ سمجھو کہ میں نے کیا لکھا ۔ ہاں سمجھنا نہ چاہو تو کیونکر سمجھ میں آئے ۔ اور کوئی تمہیں سمجھائے ۔ کسی دانشمند کا قول ہے کہ "محبت یکطرفہ نہیں ہوتی ۔ اور اگر ہو تو وہ محبت نہیں ہوگی" ۔ یعنی انسان کو محبت صرف اسی سے ہو سکتی ہے جو محبت کا جواب محبت سے دے سکے ۔ اس کے بغیر کسی کو چاہنا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی ایک حسین مورت کو پوجنا ۔ میرا بھی ہمیشہ سے یہی عقیدہ تھا کہ جسے میرے ساتھ دلچسپی نہ ہو میں کبھی اس سے محبت نہیں کر سکتا ۔ مگر آہ پنہاں ! تمہاری سحر کار آنکھوں نے میرے تمام استوار عقیدوں کو نقش بر آب ثابت کر دیا ۔

اصولاً میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ جسے اپنی ذات سے کوئی دلچسپی نہ ہو اسے چاہنے کے کوئی معنی نہیں ۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ جذبات کی دنیا منطق کے

اصولوں کی پابند نہیں۔ میں نے ہر طرح اِس نامراد دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ دیوانے! جو تیری بات تک نہ سمجھے بلکہ نہ سمجھنا چاہے۔ بھلا وہ تیرے جذبات واحساسات کو کیا سمجھے گا۔ آخر اس محبت کا انجام اندوہِ محرومی کے سوا اور کیا ہوگا؟ مگر وہ میری کب سنتا ہے۔ خلش میں اس کے لئے ایک کیف ہے۔ تڑپ میں اُسے لذّت ملتی ہے۔ اُس نے اپنی ایک خیالی دنیا بنائی ہے۔ ایک کافر جوانی کو اس میں آباد کیا ہے۔ اور اس کی پرستش کو مدعائے زندگی سمجھا ہے۔

پنہاں! مجھے کوئی حق نہیں کہ تم سے بے التفاتی کا شکوہ کروں میں نے خود ہی اپنی جان کو یہ روگ لگایا ہے۔ میں خود ہی اس کا ذمہ دار ہوں۔ اور صرف مجھی کو اس کا عذاب سہنا ہوگا۔ اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں نے خواہ مخواہ تم سے کچھ امیدیں قائم کرلیں۔ اور اب جو وہ پوری نہیں ہوئیں تو دل کو رنج ہوتا ہے۔ ایسا رنج جس نے میری راتوں کی نیندیں کھو دی ہیں۔ جس نے میرا سکون مجھ سے چھین لیا ہے۔ آہ کیا کروں۔ کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ تمہارے بے احساس دل میں بھی محبت کی ایک ننھی سی چنگاری روشن کر دیتا پھر اپنے نیازِ واردات کے دامن سے اُسے ہوا دیتا۔ وہ مشتعل ہوتی۔ بھڑکتی۔ پھیلتی اور بڑھتی۔ یہاں تک کہ اس کے شعلے تمہارے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی طرح سرد و خاموش دل کو گرما دیتے۔ اس میں زندگی کی رُوح پھونک دیتے تمہارے خوابیدہ جذبات انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو جاتے۔ اور تم سمجھتیں

کہ صرف چاہنا اور چاہا جانا ہی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:-

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو

فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے

پنہاں! تم اس دفترِ بے معنی کو پڑھتے پڑھتے اکتا جاؤ گی۔ ایسی ابتر تحریر جس کا نہ سر ہے نہ پیر، شاید تم نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو گی۔ معاف کرنا پنہاں! میں بالکل بے اختیاری کے عالم میں لکھتا چلا گیا۔ اور اتنا کچھ لکھ ڈالا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرا کیا لکھنے کا ارادہ تھا۔ اب اس کے سوا اور کیا کہوں۔ کہ درد دینے والے! خدا تجھے خوش رکھے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے تیرا شکر گذار ہوں۔ یہ درد میرے لئے ایک لذت ہے۔ ایک نعمت ہے۔ ایک نئی زندگی ہے۔ جس کی مجھے انتہا سے زیادہ آرزو تھی۔ کس طرح کہوں کہ میری تحریر کا جواب دیجئے۔ آخر مجھے اس کا کیا حق ہے۔ مگر نہ جانے کیوں آج میرا دل ایسا محسوس کر رہا ہے کہ ممکن ہے۔ آپ کو یہ خیال آجائے کہ "اگر میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند لفظ ایک مضطرب دل کیلئے سامانِ سکون ہو سکتے ہیں تو لاؤ لکھ دوں۔ میرا اس میں کیا حرج ہے۔" اور آپ کا قلم میرے لئے سرمایۂ تسکین فراہم کر دے۔ فقط۔

تمہاری جادوگر آنکھوں کا قیدی۔"

اگلے دن اس خط کا جواب آیا۔ کاغذ کے ایک چھوٹے سے پرزے پر یہ عبارت

تحریر یہ تھی :-

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ مجھ کو سخت الجھن ہے۔ براہِ کرم کسی اور مشغلہ سے دل بہلائیے۔ آپ میری پابندیوں اور مجبوریوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ایک ذرا سا گمان ابا جان کیلئے میرے خون کو جائز کر دے گا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ بات اُن سے پوشیدہ رہے۔ کیونکہ ایسے اہم واقعات کہیں چھپ سکتے ہیں۔ للہ فلا انجام پر بھی نظر کیجئے۔ میری تو روح تحلیل ہوئی جا رہی ہے۔ نیچ۔ یک۔ نام[1] کا توسط بھی انتہائی خطرناک ہے۔"

شاہدہ کا یہ پہلا خط تھا۔ جو اس نے مجھے لکھا۔ یہاں تو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس تحریر نے تیل کا کام کیا۔ فی الفور جواب لکھا :-

"شاہدہ۔ میری پیاری! کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اس لطفِ خاص کا کہ تم نے زحمتِ تحریر گوارا کر کے مغموم دل کو خوشی سے لبریز کر دیا۔ مگر آہ، ہماری مسرتیں کس قدر ناپائدار ہوتی ہیں۔ ابھی خط پڑھ کر تمام کیا تھا۔ کہ مستقبل کے بھیانک تصورات سے کلیجہ کانپنے لگا۔ ہاں پیاری شاہدہ یہ سچ ہے کہ تمہاری قید نہایت سنگین ہے۔ تم سے ملنا۔ باتیں کرنا یقیناً ہونا

---

[1] "مجن کی ماں" کو اُلٹ کر "نیچ یک نام" بنایا ہے۔

عالم خیال کے سوا اور کہاں ممکن ہے تم نے لکھا ہے " للہ ذرا انجام پر بھی نظر ڈال لیے" آہ، شاہدہ، تمہیں یقین نہ آئے تو کیا کروں۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انجام پر نظر ڈالنے کی قوت تمہاری سحر کار آنکھوں نے پہلے ہی سلب کر لی سب کچھ دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں مشکلیں۔ اذیتیں۔ خطرے۔ تباہیاں سب کی سب اپنی مہیب ترین شکلوں میں رونما ہوتی ہیں۔ مگر مجھ میں انکے آگے سے بھاگ جانے کی طاقت نہیں۔ پاؤں یاری نہیں دیتے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ کہ "دل انگندیم بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا" کہہ کر آنکھیں بند کر لوں اور خاموشی کے ساتھ سرنوشت ازلی پر راضی ہو جاؤں

شاہدہ تم نے لکھا ہے کہ" میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیا چاہتے ہیں" میں نے جو کچھ لکھا تھا۔ کیا واقعی تم نے اُسے ایک جنوں زدہ دماغ کا ہذیان سمجھا۔ جس کا کوئی مفہوم نہیں۔ اچھا! کیا واقعی تم جاننا چاہتی ہو۔ کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کن الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کروں۔ میری تمنّا اس قدر مبہم ہے کہ واضح طور پر میں خود بھی اُسے نہیں سمجھ سکتا۔ پھر تمہیں کیونکر سمجھاؤں۔ بہرحال کوشش کروں گا۔ کہ میری آرزو کا تمہیں کچھ اندازہ ہو جائے۔

شاہدہ تم جانتی ہو کہ دنیا میں عورتوں کے لیے مردوں کی اور مردوں کے لئے عورتوں کی کمی نہیں۔ اس لئے اگر میرا میلان صرف جنسی ہوتا تو تکمیلِ

آرزو کی ہزار صورتیں ممکن تھیں مگر میری تشنہ کام روح فقط محبت کی بھوکی ہے۔ محبت کی جستجو میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ وہ محبت مجھے تم سے ملے گی۔ کیوں شاہدہ۔ کیا تم اپنی معصوم محبت مجھے دیدو گی؟ اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ زمانے کا ستایا ہوا۔ ٹھکرایا ہوا۔ آشفتہ۔ شکستہ۔ ایک نامراد دل ہے مگر وہ تمہارے کس کام کا۔ پھر میں کس منہ سے تم سے کہوں کہ شاہدہ! جان آرزو شاہدہ! اپنی محبت۔ اپنی رنگین و روح پرور محبت مجھے دیدو۔ تمہیں یقین آئے یا نہ آئے میرے دل کو تمہاری پرستاری میں ایک آسمانی مسرت، ایک فردوسی لذت حاصل ہوتی ہے۔ جس سے میں کسی طرح دست کش نہیں ہو سکتا۔

بھولی شاہدہ۔ یہ تم نے کیا کہا" براہِ کرم کسی اور مشغلہ سے دل بہلایئے" میں تمہارے مشورہ کا شکر گزار ہوں۔ مگر لکھتے وقت کاش تم نے اتنا سوچا ہوتا کہ محبت کرنے والے دل کیلئے مرکزِ تمنا صرف ایک ذات ہو سکتی ہے۔ محبت کوئی کھیل نہیں۔ کہ جس کھلونے سے جی چاہا کھیل لئے۔ ایک نہ سہی دوسرا سہی۔ نہ یہ کوئی بازار کا سودا ہے کہ ایک دوکان پر نہ پایا تو دوسری دکان سے خرید لیا آہ۔ شاہدہ اگر یہی ممکن ہوتا تو پھر رونا ہی کیا تھا۔ کسی اور مشغلہ سے اگر جی بہلایا جا سکتا تو پھر خطروں میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شاہدہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ محبت بدلی نہیں جاتی۔ جس سے ہو گئی ہو گئی۔ البتہ یہ تنہائی

بدقسمتی ہے کہ محبت یکطرفہ ہو۔ اس میں محبت کرنے والے کیلئے اپنے آپ کو مٹانے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔ مگر جب دل پہ اختیار نہ ہے۔ تو اپنے آپ کو اس طرح مٹانے کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے؟

تمہاری پیاری تحریر پڑھنے کے بعد میں نے یہ ارادہ کیا تھا۔ کہ اب کبھی اس کا جواب نہ لکھوں گا۔ تاکہ تمہارے مطمئن دل کو انتشار و اضطراب سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ کرنے کو تو یہ عہد میں نے کر لیا۔ مگر اس کے بعد شاہدہ تمہاری کافرساز آنکھوں کی قسم! دل کو جیسی اذیت ہوئی۔ بس کیا بتاؤں خصوصاً رات جس بے کلی میں بسر ہوئی۔ اس کی لذت بس کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ بار بار تمہارے یہ الفاظ کہ "ایک ذرا سا گمان ابا جان کے لئے میرے خون کو جائز کر دے گا۔۔۔۔ میری تو روح تحلیل ہوئی جاتی ہے"۔ مجسم ہو کر میرے سامنے آجاتے تھے اور میں خوف سے لرز جاتا تھا۔ نہیں شاہدہ۔ خدا کے لئے اس قسم کے ہولناک تصورات سے اپنی معصوم روح کو عذاب میں مبتلا نہ کرو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ تمہاری اذیت کا خیال خود میرے لئے کس درجہ سوہانِ روح ہو رہا ہے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے تمہیں خط نہ لکھنے کا عہد کیا تھا۔ مگر خدا سمجھے اس نامراد دل کو میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ اس عہد پہ قائم نہ رہ سکا۔ اور آج پھر یہ دو صفحے سیاہ کر ڈالے۔ آج کل میرے دل و دماغ کی جو

حالت ہے اس کے ہوتے ہوئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کہ کون سی بات لکھنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو بس لکھتا چلا جاتا ہوں۔ اس لئے پیاری شاہدہ اگر کوئی بات بے محل میرے قلم سے نکل گئی ہو تو تمہیں اپنے معصوم دل کی نیکیوں کا واسطہ مجھے معاف کر دینا۔

خط بہت طویل ہو گیا۔ حالانکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ جوں کا توں ہنوز میرے دل میں ہے۔ اچھی شاہدہ اس خط کا جواب جلد دینا جب تک تمہاری تحریر نہ آئے گی، میری روح تڑپتی رہے گی۔ فقط

تمہارا گرفتار"

دو دن تک کوئی جواب نہ آیا میں نے پھر تقاضا کیا۔ بڑی منتوں کے ساتھ۔ بڑے اصرار کے ساتھ۔ مگر جواب ندارد۔ آخر میں نے یہ شعر لکھ کر بھیجا:۔

میری ہر التجا کا خموشی جواب ہے
ہاں تیری آرزو کے بھی قابل نہیں ہوں میں

دوسرے دن شام کو ایک پرزہ ملا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ میں آپ کو کیا جواب دوں۔ بہتر ہوتا۔ اگر آپ خود ہی لکھ دیتے میں نقل کر کے بھیج دیتی"

ان چند لفظوں سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے مکرر جواب کی خواہش کی۔ پیا پے

تقاضوں کے بعد شاہدہ نے یہ خط لکھا۔

"آپ بار بار مجھ سے جواب طلب کرتے ہیں۔ خدا کی قسم میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ جواب دوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ میرے تمام جسم کی قوت سلب ہو رہی ہے۔ دماغ بالکل بیکار ہو گیا ہے۔ کاش آپ میری پریشانیوں کا اندازہ کر کے مجھے قابلِ رحم سمجھتے۔ میں ایک بار پھر عرض کرتی ہوں۔ کہ للہ انجام پر غور کیجئے۔ معاملہ نہایت پیچیدہ ہو رہا ہے۔ کئی بار دل چاہا کہ آپ کو کل حالات سے آگاہ کر کے اِس خطرہ میں پڑنے سے باز رکھوں لیکن اپنی بے وقوفی پر خود ہنسی آئی۔ کہ آپ کو سمجھانا سورج کو چراغ دکھانا ہے موجودہ "واسطہ" بھی نہایت ہی خطرناک ہے۔ ملازمین بہت بدتمیز ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یا تو آپ اُسے ہمیشہ اپنے پاس رکھیں گے اور اس کی ہر گستاخی کو خاموشی سے سنیں گے۔ یا پھر راز فاش ہو گا۔ بہر کیف دونوں حالتیں تکلیف دہ ہیں۔ آپ ایک بار پھر غور کیجئے۔

ایک گذارش۔ وہ یہ کہ میرا یہ خط اور پہلا خط براہِ کرم واپس کر دیجئے تاکہ میں خود انہیں چاک کر کے مطمئن ہو جاؤں۔"

اس خط کا جواب نقل کرنے سے پیشتر ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ عید قریب تھی۔ شاہدہ نے ایک ریشمی کپڑا زبیدہ کے پاس بھیجا۔ اور یہ پیام کہ "سنا ہے تمہارے بھائی جان کا ٹیلر ماسٹر زنانہ کپڑے بہت اچھے سیتا ہے اگر یہ صحیح

ہے تو میرا قمیص اس سے سلوا دو۔ مگر دیکھنا کہیں کپڑے کا ستیاناس نہ کر دے۔ خراب سیا تو کپڑے کے دام تم سے رکھوالوں گی۔

میں نے شاہدہ کا قمیص خاص اہتمام سے سلوا کر بھجوا دیا۔ اس کے چند روز بعد میں نے یہ خط لکھا:۔

شاہدہ۔ میری پیاری، تمہاری امانتیں واپس بھیج رہا ہوں۔ انسان بھی اپنے متعلق کیسا خوش گمان ہوتا ہے۔ میری حماقت دیکھو۔ میں نے خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا تھا۔ کہ تم مجھ پر اعتماد کر دگی۔ اپنی امانتوں کو میرے پاس محفوظ سمجھو گی، مگر جلد ہی اس خود فریبی کی حقیقت کھل گئی۔ شاہدہ تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ تمہارے ان خطوں کے واپس مانگنے سے مجھے کس قدر صدمہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی چیز کے واپس لینے کا حق انسان کو ہر وقت حاصل ہے۔ مگر سوال اعتماد کا ہے۔ کیا تم لکھ دیتیں کہ چاک کر دو تو میں چاک نہ کر دیتا۔ اس کے علاوہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں ان کی حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی یا غفلت برتتا جس وقت میں نے تمہارا خط تمام کیا اور خاتمہ پر یہ الفاظ دیکھے کہ "میرے خط واپس کر دیجئے"۔ تو خدا کی قسم شاہدہ یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے میرے سینہ میں ایک گھونسہ مارا۔ بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ اور کتنی ہی دیر تک میں سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ آخر میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھایا کہ "دیوانے آخر تو نے یہ فرض ہی کیوں کر لیا کہ

انہیں تجھ پر اعتماد ہونا چاہیے۔"

شاہدہ، تم کس قدر شوخ ہو، کس قدر شریر ہو۔ صورت ہے تو اس قدر بھولی بھالی معلوم ہوتی ہو" میں آپ کو کیا جواب دوں۔ بہتر ہوتا اگر آپ خود ہی لکھ دیتے۔ میں نقل کر کے بھیج دیتی" جس وقت میں نے یہ جملے پڑھے شوخی و شرارت کی ایک تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی بس بے اختیار یہ جی چاہا کہ اس کے جواب میں گدگدا دوں۔ اور جن شریر ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ انہیں اپنے لبوں سے سزا دوں۔ مگر آہ یہ حسرت عالم خیال کے سوا اور کہاں پوری ہو سکتی ہے۔

شاہدہ تم نے انجام پر غور کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اب تک میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ نہیں شاہدہ ایسا نہیں میں نے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کیا۔ نشیب و فراز کو خوب سوچا سمجھا۔ عواقب و نتائج پر بار بار نظر ڈالی۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ جانتا ہوں کہ میں شعلوں سے کھیل رہا ہوں۔ جو مجھے جلا ڈالیں گے۔ نبات سمجھ کر زہر قاتل کی ڈلیاں چبا رہا ہوں۔ جو مجھے ہلاک کر دیں گی۔ زہریلے ناگ کے خوبصورت رنگ پر فریفتہ ہو کر ایک نادان بچہ کی طرح اُسے ہاتھ میں اٹھا لیا ہے۔ اور منہ میں رکھ لینا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے ڈس لے گا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ سب کچھ سمجھ

رہا ہوں۔ مگر عقل کو جذبات نے کچھ اس بُری طرح مغلوب کر لیا ہے کہ خطرات کا احساس ہی مٹ گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں یہ سوچنا بھی پسند نہیں کرتا کہ کیا ہوگا۔ آئندہ کے تصوّر سے میرے خوابِ رنگین میں برہمی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے مستقبل کی طرف ایک غلط انداز نظر ڈالنا بھی مجھے گوارا نہیں۔ آج میرے لئے زہر میں تریاق کی خاصیت ہے۔ آبِ حیات کی لذّت ہے۔ شعلہ و شرر کو میں پھول اور کلیاں سمجھتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ میرا دامن اُن سے بھرا رہے۔ تمہیں بتاؤ۔ جب یہ کیفیت ہے تو میں کیا کروں۔ عقل کا حکم ماننے کی قوت مجھ سے یکسر سلب کر لی گئی ہے۔ اُس ساعت کو یاد کرتا ہوں۔ جب پہلی بار تمہاری قاتل آنکھوں نے زہر آلود تیر و نشتر میرے دل و جگر میں پیوست کر دئے تھے۔ ہائے تمہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ شاہدہ اب وہ زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ خون کے ہر قطرہ میں شامل ہو گیا ہے۔ اب اس سے بچنا کہاں ممکن ہے۔ ہر آنے والا دن میری قید کو سنگین تر کر دیتا ہے۔ ہر روز میری بے اختیاریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بتاؤ اب میں بھلا کہاں جاؤں۔ محبت کی نہ ٹوٹنے والی زنجیر جو تم نے مجھے پہنا دی ہے۔ اس سے کس طرح آزاد ہو جاؤں۔

اس سلسلہ کو منقطع کرنے کی شاید ایک تدبیر تمہارے ذہن میں آئے اور اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر شاید تم اسے ایک کامیاب علاج سمجھو۔ مگر

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ممکن ہے تم یہ سوچو کہ "لاؤ تنا تا شروع کر دوں۔ اور تانا تسا ؤں۔ اتنا آزار دوں کہ یہ ترک محبت پر مجبور ہو جائے"۔ مگر پیاری شاہدہ یقین رکھو۔ اس تدبیر میں تمہیں کبھی کامیابی نہ ہو گی۔ کامیابی ہو جاتی۔ اگر میرا مطمح نظر صرف تمہاری "جنس" ہوتی۔ مصائب کے طوفان میں ہوس کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ مگر "محبت کے لئے ہر اذیت ایک لذت ہے۔ اس کی بنیاد پہاڑوں کی طرح استوار اور قطب کی طرح پائدار ہوتی ہے۔ بہرحال اگر تم اس کا تجربہ کرنا چاہو تو مجھے اسپر کوئی اعتراض نہیں نتیجہ خود تمہارے سامنے آجائیگا۔ مجھے پیشینگوئی کی ضرورت نہیں۔

شاہدہ کل سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید میری بیتابیوں نے تم پر بھی کچھ اثر کیا ہے۔ میرے سینہ میں بھڑکنے والی آگ نے غالباً تمہارے جامد دل کو بھی گرمایا ہے تمہارے خوابیدہ جذبات کو جگایا ہے۔ ممکن ہے یہ سب کچھ میرا واہمہ ہو۔ تخیل کی کارفرمائی ہو۔ جو کچھ بھی ہو۔ بہرحال اس رنگین خواب نے مجھے مدہوش کر رکھا ہے۔ دل کی کچھ عجب کیفیت ہے۔ میرے لکھنے کے بغیر شاید تم سمجھ سکو۔ شاہدہ تمہارے معصوم تصور کی قسم! مجھے اس خیال سے بے انتہا اذیت ہے کہ میں تمہارے لئے انتشار و اضطراب کا سبب ہو رہا ہوں۔ تمہاری مضطرب تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور میں شرم و ندامت کے مارے تم سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔

شاہدہ۔ کچھ نہیں معلوم ہے کہ وہ پیراہن جو تم نے عید کے دن زیب بدن کیا تھا۔ تم تک پہونچنے سے قبل کہاں کہاں رہا تھا۔ شاہدہ۔ میرے لبوں نے۔ میری آنکھوں نے۔ میرے ہاتھوں نے اُسے چھوا تھا۔ اس کے لمس حریری نے میرے جسم میں ایک سنسنی سی پیدا کر دی تھی۔ میری روح نے ایک کیفیتِ اہتزاز محسوس کی تھی۔ میں نے اُسے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹ اُس پر رکھ دیئے۔ اور ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے تمہاری عریاں باہیں اور گردن میرے لبوں سے مس ہو رہی ہیں۔ اس تصور سے ایک بجلی سی میرے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ سینہ میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ کاش الفاظ میں اس کیفیت کے اظہار کی قدرت ہوتی۔ اور میں بیان کر سکتا۔ تو مجھے یقین ہے کہ تم خود بھی ایک لمحہ کے لئے بے خود ہو جاتیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میری آنکھیں اور میرے لب اس پیکرِ شباب و مستی کو نہیں چھو سکتے۔ تو کم سے کم اس پیرہن سے تو مس ہو سکتے ہیں۔ جو اُسے اپنے آغوش میں لے کر آزادی کے ساتھ جس حصہ کو چاہے گا چھوئے گا۔ چومے گا۔ مس کرے گا۔ تو گویا ایک واسطہ سے میرے لبوں کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے اُسے چوما۔ اور بار بار چوما۔ بار بار آنکھوں سے لگایا۔ اور کتنی دیر اُس پر منہ رکھے رہا۔ شاہدہ سچ کہنا۔ اُسے پہنتے وقت کوئی نئی کیفیت تو تم نے

محسوس نہیں کی تھی۔ یا اس تحریر کے پڑھنے کے بعد کوئی خاص احساس تو پیدا نہیں ہوا۔

شاہدہ، جانِ آمند و شاہدہ، میری دنیائے تخیّل کو کیمیر رنگ و بو میں تبدیل کر دینے والی شاہدہ۔ خدا کی قسم رات سے دل بہت ہی بےچین ہے۔ کیا کہوں کیسی الجھن ہے کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ اب جب تک تمہارا خط نہ آئے گا۔ روح بیکل ہی رہے گی۔ فقط

تمہارا . . . . . "

"یہاں کیا لکھوں شاہدہ؟ جو تم کہو گی آئندہ وہی لکھوں گا"

اس طرح میری اور شاہدہ کی خط و کتابت جاری ہو گئی۔ مگر آہ اس کا حسرتناک انجام! اس کے تصوّر ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ زندگی ہے تو وہ اندوہناک داستان کسی دوسری صحبت میں سنا دوں گا۔ فقط

سچی کہانی

چوری

رفیق جس وقت کمرے میں داخل ہوا، واجد میز پر کہنی ٹیکے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ رفیق کے پاؤں کی آہٹ سن کر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں مسکرائے۔ رفیق، واجد کے مقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی وقت ضائع کر رہا ہوں" واجد نے مسکراتے ہوئے ایک مایوسانہ لہجے میں جواب دیا۔

رفیق شاید سب کچھ جانتا تھا۔ واجد کے الفاظ سے متاثر ہو کر اُس نے کہا۔

"کاش تم اپنے قیمتی وقت کو اس طرح ضائع کرنے کی بجائے کسی مفید کام میں صرف کرتے۔"

"کاش قدرت کو یہ منظور ہوتا" واجد نے اور بھی یاس انگیز لہجے میں کہا۔

"واجد! اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار قدرت کو ٹھہرانا کوئی دانش مندی کی بات نہیں!"

"پہلے میرا بھی ایسا ہی خیال تھا۔ مگر اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری خواہش، میرا ارادہ، میرا اختیار کچھ بھی میرا نہیں۔ مجھے اگر اپنے ارادو دل پر اختیار ہوتو زندگی کی نامرادیاں میرے قلب و روح کو اس طرح نہ کچلتیں" اتنا کہہ کر واجد خاموش ہو گیا اور اپنی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ پر سہارا دے کر کسی گہری فکر میں ڈوب گیا۔ رفیق نے میز پر سے وہ رائٹنگ پیڈ اٹھا لیا۔ جس پر واجد لکھ رہا تھا۔ یہ حوری کے نام ایک نا تمام خط تھا۔ رفیق نے پڑھنا شروع کیا۔

"حوری! جانِ آرزو! تمہیں اِس بات سے کوئی دل چسپی تو نہیں ہو سکتی کہ میرے شب و روز کس طرح کٹ رہے ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ میری خاطر سے تم اِس بے کیف کہانی کو سننے کے لئے آمادہ ضرور ہو جاؤ گی۔

حُوری تم نے ہر محفل میں مجھے ہنستے بولتے دیکھا ہے۔ یقیناً تم یہی سمجھتی ہو گی کہ دنیا کی ساری مسرتیں شاید میرے ہی حصے میں آگئی ہیں۔ مگر درحقیقت میرا حال یہ ہے کہ ؎

زخمِ دل کے چھپا رہا ہوں میں
کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

ہاں کبھی کبھی جب دل پر غم کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے اور جی اُمڈنے لگتا ہے تو میرے لبوں پر مہرِ خاموشی ثبت ہو جاتی ہے۔ خوش نظر آنے کی کوشش کے باوجود، شاید اُس وقت میں اُداس نظر آنے لگتا ہوں۔ اسی لئے تم نے ایک بار مجھے اُس عالم میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

"آپ اتنے خاموش کیوں ہیں۔؟"

حُوری اگر اُس وقت تم میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھتیں تو شاید ان آبگینوں میں سے میری مضطرب روح کی تصویر تمہیں نظر آ جاتی۔ شاید تمہیں یاد ہو، میں نے منہ پھیر لیا تھا۔ کیونکہ تمہارے اِس سوال پر میری چھلکتی ہوئی آنکھیں بے اختیار چھلکنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ پھر میں نے مشکل سے دل کو سنبھالا۔ تم نے پھر وہی سوال دہرایا :-

"ہاں تو بتایئے۔ آج آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟ کیا طبیعت کچھ ناساز ہے؟"

میں نے ٹالنا چاہا۔ تم نے اصرار کیا۔ آخر میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک واقعے کے ضمن میں تمہیں یہ شعر سُنایا ؎

شکریہ پُرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر
پُوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

لطف یہ کہ وہ پورا واقعہ تمہیں پہلے سے معلوم تھا اور یہ بھی کہ یہ شعر کس کا ہے شعر سُن کر تم نے بات کو اس طرح ٹال دیا جیسے اس معاملہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ایسا اور بھی کئی بار ہوا کہ میں بات کرتے کرتے اچانک اپنے خیالات میں کھو گیا۔ یکایک

چُپ ہو گیا۔ اور تم نے استفسارِ حال کیا۔ مگر میں کیا بتاتا۔ اور یہ بھی نہیں کہ نہ بتایا ہو۔ مگر بات جب "اس" نقطے پر پہنچی تو تم نے ہمیشہ ہی اسے ٹال دیا۔

تمہاری ایک بات کسی طرح فراموش نہیں ہوتی۔ ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ فرض کرو میز پر ہر قسم کے پھل چُنے ہوئے ہیں ہیں اگر ان میں سے کوئی پھل اپنے ہاتھ میں اٹھاؤں تو کوئی مجھے ٹوکے گا بھی نہیں۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ "کوئی" اپنے ہاتھ سے اٹھا کر مجھے دے۔

تم نے کہا: "لیکن اگر وہ پھل پہلے ہی کسی کو دیا جا چکا ہو تب؟"

میں اس کا جواب کیا دیتا۔ ہاں اپنی بے بسی کے احساس سے دل پر چوٹ ضرور لگی۔

حوری! کہی ہوئی بات کو بار بار دوہرانے میں کوئی لطف نہیں، مگر میرے پاس تم سے کہنے کے لئے کوئی نئی بات ہے ہی نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں۔ تم سے دُور ہوتا ہوں تو آنکھیں شدت سے آرزومند ہوتی ہیں۔ تمہیں دیکھنے کے لئے دل بے اختیار مچلنے لگتا ہے۔ تمہارے پاس پہنچنے کے لئے۔ اور میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ دنیا کے سارے کاموں کو پسِ پشت ڈال کر دیدہ و دل کی تسکین کا سامان بہم پہنچاؤں۔

مگر کیا اس میں مجھے کامیابی ہوتی ہے؟ کیا تمہارے پاس پہنچ کر مضطرب دل تسکین پاتا ہے؟ نہیں حوری۔ تیرے ہی روئے دل آرا کی قسم، دل کی بے کلی کچھ اور

بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر جب گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھنے کے بعد تم سے رخصت ہوتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اپنا سب کچھ کھو کر آ رہا ہوں۔

للّٰہ بتاؤ میں کیا کروں۔ ہائے حوری یہ تم نے مجھے کیا کر دیا۔ میرے دن کتنے اُداس، کتنے ویران ہیں۔ میری راتیں کتنی تنہا، کتنی سنسان ہیں۔ کتنی بے چین گھڑیاں قدرت نے میرے لئے مخصوص کر دی ہیں کبھی کبھی تو آدھی رات سے پچھلے پہر تک گھڑی کی ٹِک ٹِک اور گھنٹوں کی آواز سنتا ہوں۔ بیشتر رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ بے خوابی سے آنکھیں جلنے لگتی ہیں جسم تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ تاہم دن کی آرزو میں رات کسی طرح بسر ہوتی ہے لیکن ہر آنے والا دن، گزرنے والے دن سے کچھ زیادہ ہی مایوسیاں اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور راتوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔

کبھی کبھی تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ مگر حالات جی کھول کے رونے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ سوچتا ہوں قصور خود میرا ہے۔ تمہیں بے مہری کا الزام کیوں دوں۔ تمہارا دل اگر میری طرف ملتفت نہیں ہوتا تو تمہارا اس میں کیا قصور۔ یہ تو کچھ اختیار کی بات نہیں۔ میرے پاس خاطر میں تو تمہاری طرف سے کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس کا مجھے اچھی طرح احساس ہے اور دل سے ممنون ہوں۔ لیکن اگر میرے دل کی آگ تمہارے سینے میں ایک ننھی سی چنگاری بھی روشن نہیں کر سکتی تو تم کیا کرو۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ میری حیثیت اُس صراحی کی سی ہے جو شراب سے خالی ہو خالی صراحی سے تو آج تک کوئی مست نہیں ہوا۔ میرے اندر کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو تمہارے

جذبات کو برانگیختہ کرسکے۔ یہ حقیقت ہے۔ طنز نہیں، انکسار نہیں، مبالغہ نہیں۔

اِن حالات میں مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں گلہ ہے تو اپنے مقدر سے۔ ہائے قسمت نے کہاں پھنسایا کیسی مجبوری، کیسی بے بسی ہے۔ سوچتا ہوں چکور بھی تو کبھی چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔ پروانہ بھی تو جل کر خاک ہو جانے کے سوا شمع سے اور کچھ نہیں پاتا۔ بلبل بھی تو پھول کے لئے چیختے چیختے جان دے دیتا ہے۔ پھر اگر میں بھی محروم ہوں۔ اگر میں بھی جل جل کر، تڑپ تڑپ کر ہر روز زندگی سے دُور ہٹتا جاتا ہوں۔ تو اس میں تعجب کی بات کونسی ہے بعض اوقات "کسی" کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ اور بے اختیار یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں ؎

پھولوں کی جو قدر نہ جانے، پھول ہوں اُسکے دامن میں

نکہتِ گل میں جان ہو جس کی ہائے نہ پائے گلشن میں

کیا خدا کی شان ہے۔

اور کبھی تمہاری اِس "ضد" سے، جو حقیقت قابلِ شکایت نہیں۔ دل میں نشتر سے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ کتنی بار تم سے ایک چیز کی التجا کی، کتنی بار منت کی۔ مگر تم نے ہمیشہ ہی اس التجا کو ٹھکرا دینے کے قابل سمجھا۔ ایک دن خدا جانے کیا تمہارے جی میں آئی کہ تم نے شاید میرا دل رکھنے کیلئے کہہ دیا تھا کہ اچھا کل . . . "

تمہارے اس ایک لفظ سے آرزو کی کتنی شمعیں میرے سینے میں روشن ہو گئیں مگر صرف اس لئے کہ دوسرے ہی دن مایوسی کی آندھی سے ایک ایک کر کے بجھ جائیں

تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ وہ رات کس بے چینی کے ساتھ بسر ہوئی۔ دوسرے دن جب میں نے تمہارا وعدہ تمہیں یاد دلایا اور تم نے کہا کہ:

"وہ وعدہ تھوڑی تھا۔ وہ تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی"

تو بس میرا ہی دل جانتا ہے کہ مجھ پر کیا گزری۔ دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا "سچ ہے۔ محبت جبر سے نہیں ہوتی"

اور شاید وہ جمیل کی پارٹی کا واقعہ بھی تمہیں یاد ہو۔ جس وقت تم نے پان کھایا اُف، کس قدر خوبصورت ہو گئے تھے۔ تمہارے ہونٹ، جیسے تازہ تازہ رسیلی اسٹابری، جیسے پہاڑی چکور کی منقار۔ میں نے ایک والہانہ انداز سے تمہاری طرف دیکھا۔ تم نے رُخ پھیر لیا۔ میں نے کہا "حُوری، اللہ مجھے اِس رُوح پرور نظارے سے محروم نہ کرو۔ جو کچھ میں دیکھنا چاہتا ہوں مجھے دیکھنے دو۔ مگر تم نہایت خاموشی کے ساتھ بیٹھی۔ میری التجاؤں کو اِس طرح سنتی رہیں۔ جیسے تم نے کچھ نہیں سنا۔ نہ صرف اس قدر، بلکہ تمہارا ہاتھ میری آنکھوں اور تمہارے لبوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ بے شک تمہیں اِس کا حق حاصل تھا۔

صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ تو میں نے مانا کہ دل کو بہ زور کسی طرف مائل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کیا میری ایک نہایت بے ضرر، نہایت معصوم التجا، تمہاری ایک نظر کی التجا بھی ایسی چیز تھی۔ کہ میرے پیہم اصرار کے باوجود تم اُسے قبول کرنے سے انکار کر دو۔ کیا نگاہوں کا ملنا بھی جرم و گناہ ہے؟ کتنی بار میں نے تم سے یہ التجا کی۔

مگر بے درد۔ تو نے کبھی ایک بار بھی میری اِس آرزو کو پورا نہ ہونے دیا۔ زندگی میں کبھی ایک بار بھی تو ہماری نگاہیں چار نہیں ہوئیں۔

تم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ کبھی مجھ سے نظر نہ ملاؤ گی۔ احتیاط بے شک اچھی چیز ہے مگر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ خیر تم اِسی کو پسند کرتی ہو کہ میری تشنہ کام آنکھیں تمہاری نگاہوں سے بھی سیراب نہ ہونے پائیں۔ تو میں بھی آئندہ کبھی تم سے اِس کی خواہش نہ کروں گا؛ مگر کیا مجھے اِن دو مصرعوں کے دہرانے کی بھی اجازت نہیں؟

نہ جانے کس کے لئے وقف ہے جہانِ جمال!

ہم اِک نظر کو ترستے ہیں اور نصیب نہیں

حوری سچ کہو، کیا تم اِس بات کو بھی پسند نہیں کرتیں کہ میں تمہارا نام لے کر تمہیں پکاروں۔ تم کہو گی: "میں نے کب منع کیا۔" منع تو بے شک نہیں کیا لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ میں نے کتنی بار تمہارے نام کو دہرایا۔ کتنی بار حوری۔ حوری کہہ کر تمہیں مخاطب کیا۔ مگر تم نے کبھی ایک بار بھی "جی" کہنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

ایک بات اور یاد آ گئی۔ شاید تمہیں بھی یاد ہو۔ اُس دن بالکل تنہائی تھی۔ تمہاری باہیں خلافِ معمول بازوؤں تک کھلی ہوئی تھیں۔ اُف، کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ عریاں باہیں۔ بے اختیار میری آنکھوں نے تمہارے بائیں بازو کو چوم لیا۔ تم نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ پھر میرے تشنہ کام لب اُس سے پیوست ہو گئے۔ اُف، خدا، کس قہر کا نشہ تھا۔ اُس ایک گھونٹ شراب میں۔ کتنے دنوں تک مجھے اُس نے سرشار

بے خود رکھا۔ آج سوچتا ہوں تو یہ سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری زندگی خواب و خیال ہی تو ہے۔ اسی طرح گزر جائے گی۔ خوابوں کو حقیقت بنتے کس نے دیکھا ہے۔ یہ شیریں خواب بھی یاد ہے اور وہ تلخ حقیقت بھی۔ جب میں نے یکایک تمہارا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اور تم نے بہ زور میرے ہاتھ کو جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا اس کراہت کے ساتھ جیسے کوئی کسی گندی چیز سے اپنے آپ کو بچائے۔ اُس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ اب میرے لئے رعایتِ خاطر بھی تم سے ممکن نہیں یقین ماننا مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ مجھے اچھی طرح محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ساتھ جیسا سلوک تم نے کیا میں اسی کا مستحق ہوں۔

آہ۔ کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں۔ لکھتا چلا جا رہا ہوں۔ صفحے کے صفحے سیاہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اس خامہ فرسائی کا حاصل؟ اس آہ و زاری کا نتیجہ؟ تم اس دفترِ بے معنی کو پڑھتے پڑھتے اُکتا گئی ہوگی۔ میری اچھی حورہی مجھے معاف کردو۔ خدا شاہد ہے۔ میرا ارادہ خواہ مخواہ تمہیں پریشان کرنے کا نہ تھا۔ مگر قلم بے اختیار لکھتا گیا۔ اب جو سوچتا ہوں تو . . . . . .

خط تمام کرنے کے بعد رفیق نے رائٹنگ پیڈ پھر میز پر رکھ دیا۔ واجد اُسی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ اپنے خیالات میں گم۔ گرد و پیش سے بے خبر۔ اُس کی آنکھوں میں یاس رچی ہوئی تھی۔

رفیق نے دھیمی آواز میں کہا:

"واجد!"

"ہوں"

"میں نے خط پڑھا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری اِس قسم کی تحریروں سے حوری پر کچھ اثر پڑے گا؟ اس کے دل میں تمہارے لئے کوئی گنجائش پیدا ہو جائے گی"

"نہیں۔ ہرگز نہیں"

"تو پھر اس طرح وقت برباد کرنے اور اپنی قوّتوں کو بیکار رکھونے سے حاصل؟"

"رفیق! میں بچہ نہیں سب کچھ جانتا ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ میری یہ تحریر یا کوئی تحریر حوری کے دل کو ذرّہ بھر بھی متاثر نہیں کر سکتی۔ لیکن اس طرح دل کی بھڑاس نکلجاتی ہے۔ غم کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح، جس طرح شدتِ رنج والم میں رو لینے سے دل کو قدرے سکون ملتا ہے۔ رفیق یہ میری تحریر نہیں۔ میری آہیں اور میرے آنسو ہیں، جو لفظوں کی شکل میں کاغذ پر منتقل ہو گئے ہیں"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر میں تمہیں صرف اِس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ یک طرفہ محبت سے بڑھ کر نادانی دُنیا میں اور کوئی نہیں کاش تم اِس حقیقت کو سمجھ سکتے"

"ہائے رفیق، تمہارا خیال ہے کہ اب میں اِتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتا؟ سمجھتا ہوں اور اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یک طرفہ محبت پتھر کی مورت کو پوجنے کے برابر ہے مگر کیا کروں۔ یہ جذبہ کچھ اس شدت کے ساتھ میرے قلب و روح کے ذرّے ذرّے پر طاری ہو گیا ہے کہ اب میں اس سعئ لاحاصل ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہوں۔ تم ہی

بتاؤ میں کیا کروں کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ کسی شغل سے دل نہیں بہلتا۔ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ عیش و نشاط کے ہنگاموں سے اُلجھن ہوتی ہے۔ سیر و تفریح کی دلچسپیاں میرے لئے بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ جو میری زندگی کا بہترین مشغلہ تھا، اب وہ بھی میرے لئے کوئی دل کشی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ صرف ایک ہی آرزو ہے، ایک ہی تمنا ہے۔ ایک ہی خیال ہے۔ حوری۔ حوری۔ حوری۔ میری روح اپنی انتہائی گہرائیوں سے ہر وقت اُسی کو پکارتی ہے۔

وہ آنکھوں کے سامنے ہو یا آنکھوں سے اوجھل ہر حالت میں اسی کی پیاری تصویر خیال کے آئینے میں جلوہ گر رہتی ہے۔ جانتا ہوں کہ اس زندگی میں کبھی حوری کو نہ پاسکوں گا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ مایوسیوں کے اس طوفان میں بھی دل کسی طرح اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ حوری کے خیال سے دست کش ہو جائے۔ نہ صرف اس قدر، بلکہ ہر روز یہ آرزو بڑھتی ہی جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا!
ہر ایک سانس میں بڑھتی ہے آرزو تیری

"رفیق، یہ جنون اب واقعی جنون ہی بنتا جا رہا ہے۔ میرے لئے اب حوری کا قرب اور دوری دونوں برابر ہو گئے ہیں۔ حوری سے دور رہ کر جتنی اذیت میرے قلب کو پہنچتی ہے، پاس رہ کر اس سے کچھ کم تکلیف نہیں ہوتی۔ بلکہ قرب ظاہری کے باوجود دوری کا احساس اور بھی زیادہ جان گسل ہو جاتا ہے۔ بے کلی۔ بے کلی۔ بیکلی۔

ہر وقت بے کلی۔ ہر حال میں بے کلی۔ اُف! کتنا اضطراب میرے قلب و روح کے ذرّے ذرّے میں سما گیا ہے۔

ہاں تو اب کچھ دنوں سے میں نے وہاں کا آنا جانا بھی ترک کر دیا ہے۔ مگر تمہیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ایک طرف تو یہ دل دکھانے والی ملاقاتیں موقوف ہیں اور دوسری طرف اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ رات کے وقت میں بے اختیار گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اور وہاں پہنچ کر حورؔی کے دریچے کے مقابل کچھ دُور کھڑا، حسرت بھری آنکھوں سے دیر تک اُن روشنیوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ جو حورؔی کے شبستانِ راحت میں جگمگاتی ہیں۔

کبھی کبھی دل بھر آتا ہے۔ اور سعیٔ ضبط کے باوجود آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ حورؔی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ دیوار کے نیچے کھڑا، کون دیوانہ اپنے دل کا خون آنکھوں کی راہ سے ٹپکا رہا ہے"!

کہتے کہتے واجد کی آواز بھر آ گئی۔ اور اُس کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسوؤں کے قطرے اُس کے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔

رفیق نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموشی کے ساتھ واجد کو دیکھتا رہا؛

شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب
کشمیری بازار لاہور

قیمت ۰ [illegible]